نکاتِ قرآن

علامہ اسلم جیراجپوری

جملہ حقوق محفوظ

سن اشاعت 1996ء
محمد شاہد عادل نے
اسلم پرنٹرز سے چھپوا کر
دوست ایسوسی ایٹس اردو بازار لاہور
سے شائع کی۔

قیمت -/90 روپے

فہرست

دیباچہ	۵	سورۂ انبیاء	۱۰۹
سورۂ فاتحہ	۸	سورۂ حج	۱۱۳
سورۂ بقرہ	۹	سورۂ مومنون	۱۱۶
سورۂ آل عمران	۲۴	سورۂ نور	۱۱۷
سورۂ النساء	۳۲	سورۂ فرقان	۱۱۸
سورۂ المائدہ	۴۲	سورۂ شعراء	۱۱۹
سورۂ انعام	۴۸	سورۂ نمل	۱۲۰
سورۂ اعراف	۵۷	سورۂ قصص	۱۲۱
سورۂ انفال	۷۰	سورۂ عنکبوت	۱۲۴
سورۂ توبہ	۷۵	سورۂ روم	۱۲۵
سورۂ یونس	۷۸	سورۂ لقمان	۱۲۶
سورۂ ھود	۸۳	سورۂ سجدہ	۱۲۷
سورۂ یوسف	۸۶	سورۂ احزاب	۱۲۹
سورۂ رعد	۹۱	سورۂ سباء	۱۳۲
سورۂ حجر	۹۳	سورۂ فاطر	۱۳۳
سورۂ نحل	۹۵	سورۂ یٰسین	۱۳۴
سورۂ بنی اسرائیل	۹۸	سورۂ صافات	۱۳۶
سورۂ کہف	۱۰۳	سورۂ ص	۱۳۷
سورۂ مریم	۱۰۶	سورۂ زمر	۱۳۸
سورۂ طٰہ	۱۰۸	سورۂ مومن	۱۳۹

سورۂ حم سجدہ ۱۴۰
سورۂ شوریٰ ۱۴۱
سورۂ زخرف ۱۴۲
سورۂ دخان ۱۴۳
سورۂ جاثیہ ۱۴۴
سورۂ احقاف ۱۴۴
سورۂ محمد ۱۴۵
سورۂ فتح ۱۴۶
سورۂ حجرات ۱۴۷
سورۂ ق ۱۴۷
سورۂ والذاریات ۱۴۸
سورۂ نجم ۱۴۹
سورۂ قمر ۱۵۰
سورۂ رحمٰن ۱۵۱
سورۂ واقعہ ۱۵۱
سورۂ حدید ۱۵۱
سورۂ مجادلہ ۱۵۲
سورۂ حشر ۱۵۳
سورۂ ممتحنہ ۱۵۴
سورۂ صف ۱۵۴
سورۂ جمعہ ۱۵۵
سورۂ منافقون ۱۵۵
سورۂ تغابن ۱۵۶
سورۂ طلاق ۱۵۶
سورۂ تحریم ۱۵۷
سورۂ قلم ۱۵۸
سورۂ حاقہ ۱۵۹
سورۂ معارج ۱۶۰
سورۂ نوح ۱۶۰
سورۂ جن ۱۶۱
سورۂ مزمل ۱۶۱
سورۂ مدثر ۱۶۲
سورۂ قیامہ ۱۶۲
سورۂ الدھر ۱۶۳
سورۂ مرسلات ۱۶۳
سورۂ تکویر ۱۶۴
سورۂ انفطار ۱۶۵
سورۂ فجر ۱۶۶
سورۂ بینہ ۱۶۷
سورۂ الزلزال ۱۶۷
سورۂ فیل ۱۶۸
سورۂ کافرون ۱۶۹
سورۂ والناس ۱۷۰

دیباچہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدِ نِ الْمُصْطَفٰی وَعَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی۔

امابعد! میں نے جب علماء معانی و بیان کی تفسیریں مطالعہ کیں تو ان میں جابجا نکتے نظر آئے جو انہوں نے قرآن سے نکالے ہیں اور دل کش معلوم ہوئے۔ میری خواہش ہوئی کہ میں اُردو خواں طبقہ کے لئے اس قسم کے نکات کا ایک مجموعہ مرتب کروں تاکہ اُن کو قرآن کے ساتھ دل چسپی ہو۔ مگر ان تفسیروں میں جو نکتے ملے وہ زیادہ تر قرآن کے الفاظ اور عبارت سے متعلق تھے جو صرف عربی دانوں کے لئے کارآمد ہو سکتے ہیں اور جو معنوی نکتے ہیں ان میں ان حضرات نے زیادہ تر روایات سے کام لیا ہے جس کو میں آیات کی تفسیر میں جائز نہیں سمجھتا کیونکہ روایات غیر یقینی ہیں ان سے آیات کی قطعیت کھوئی جاتی ہے۔ خاص کر تفسیری روایتیں تو خود ائمہ حدیث کے نزدیک بے بنیاد ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جو امیر المومنین فی الحدیث کہے جاتے ہیں ان کا قول ہے۔

تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں۔ ملاحم[1] (پیشین گوئیاں) مغازی[2] (لڑائیاں) اور تفسیر[3]۔ (تذکرۃ الموضوعات ص۸۲)

اس وجہ سے ان تفسیروں سے بہت کم چیزیں مجھے مل سکیں لیکن ان سے نکتہ نکالنے کا انداز میری سمجھ میں آگیا۔ اور قرآن کریم کے بحر زخار سے اس قسم کے

موتی میں نے خود بھی نکالنے شروع کئے اور یہ مختصر سا مجموعہ مرتب کر لیا۔ میں نے خاص طور پر خیال رکھا کہ صرف ایسے ہی نکات لکھے جائیں جن سے پڑھنے والوں کو قرآنی تعلیم کی کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور معلوم ہو خواہ وہ مختصر ہی کیوں نہ ہو۔ اس میں غیر قرآنی کوئی چیز نہیں ہے۔ سوالات بھی قرآن ہی سے ہیں اور جوابات بھی۔ جو کچھ لکھا گیا ہے نہایت اختصار کے ساتھ لکھا گیا ہے اور ہر بات کی سند آیت سے دی گئی ہے۔ جو بات قرآن کی نہیں ہے وہ نیچے حاشیہ میں لکھی گئی ہے۔

ہمارے ملک میں جو مصاحف چھاپے جاتے ہیں ان میں اب تک آیتوں کے شمار نہیں دیئے جاتے۔ اس لئے میں نے ہر آیت کے ساتھ سورۃ کا نام اور اس کے جس رکوع میں وہ ہے اس کا شمار لکھ دیا ہے کہ مراجعت میں آسانی ہو۔ سوالات بھی آیتوں سے شروع ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر سوال کی علامت س پر اس رکوع کا شمارہ دیدیا ہے جس میں وہ آیت ہے۔ رکوع کی علامت ع ہے آیتوں کے نقل کرنے میں میں نے بہت اختصار سے کام لیا ہے یعنی اُن کے صرف اتنے ہی حصّے لئے ہیں جتنے کی موقع کے لحاظ سے ضرورت تھی۔ مطالعہ کے وقت اگر قرآن سامنے رکھ لیا جائے تو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

آیتوں کے ترجمے میں نے خود کئے ہیں۔ بعض بعض الفاظ میں شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ سے مدد لی ہے کیونکہ الفاظ کی تلاش میں انہوں نے بڑی دقّتِ نظر سے کام لیا ہے ترجمہ میں کہیں کہیں زائد لفظ بھی نظر آئے گا لیکن وہ اسی آیت کے متعلقات سے ماخوذ ہے۔ میں نے اپنی طرف سے نہیں بڑھایا ہے۔ میرے پیشِ نظر یہی چیز رہی ہے کہ آیت کا صحیح مفہوم ادا ہو جائے۔

قرآن میں کہیں کہیں غامض اور مشکل عبارتیں ہیں۔ میں نے ان کو چھوڑ دیا

ہے کیونکہ وہ نکات قرآن میں نہیں آتیں بلکہ وہ مشکلات قرآن ہیں ان کے اوپر اگر زندگی نے مہلت دی تو ایک جدا گانہ رسالہ لکھنے کا ارادہ ہے۔

واللہ المستعان

محمد اسلم۔ جامعہ نگر۔ دہلی
١٥ مارچ ١٩٥٢ء

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ؕ

سُورۂ فاتحہ

سوال۔ بسم اللہ میں الرحمٰن پہلے ہے اور الرحیم بعد۔ صرفیوں کے بیان کے مطابق الرحمان مبالغہ کا صیغہ ہے جس میں رحمت کی صفت بہ نسبت رحیم کے زیادہ ہے۔ اور بلاغت کا اصول ہے ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی۔ لہٰذا پہلے الرحیم اس کے بعد الرحمان کا درجہ ہے۔

جواب۔ اہل لغت نے لکھا ہے کہ رحیم اور رحمان ندیم اور ندمان کی طرح ہم معنی ہیں۔ اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں یہاں ایک خاص نکتہ ہے ابتداء اللہ کے لفظ سے ہوئی جو باری تعالیٰ کا اسم ذات ہے اور اس کے سوا کسی کے لئے نہیں بولا جاتا۔ اس کے بعد الرحمان ہے جو اس کی مخصوص صفت ہے جس کے ساتھ وہ عرش پر مستوی ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی (طٰہٰ) پھر الرحیم ہے جو اس کی صفت بھی ہے اور مخلوق کے لئے بھی مستعمل ہے اس طرح وہ چیز جو عقل سے بالاتر تھی قریب الفہم بنائی گئی۔

س۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ہم کو سیدھے راستہ سے لگا۔ مسلمان سیدھے راستہ پر ہے۔ پھر اس کے ہدایت طلب کرنے کا مقصد کیا ہے؟

ج۔ مسلمان کو اسلام کی ہدایت حاصل ہے لیکن عقائد و اعمال میں ہر قدم پر غلط روی کا خطرہ ہے اس لئے اس کو ہمیشہ اللہ سے ہدایت طلب کرنے کی ضرورت ہے۔

سورۂ بقرہ

سؔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ یہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک نہیں ہے۔ اللہ نے اس کتاب سے ہر قسم کے شک کی نفی کی ہے۔ حالانکہ ہزاروں بلکہ لاکھوں ہیں جو اس میں شک کرتے ہیں۔

ج۔ شک اُن کے دلوں میں ہے۔ یہ کتاب محل شک نہیں۔ اس کی مثال قرآن میں ہے اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا (ج ۱) یعنی قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ لوگ اپنے دلوں میں شک رکھا کریں۔

سؔ۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ متقیوں کے لئے ہدایت ہے۔ متقی تو دہدایت یافتہ ہیں ان کے لئے ہدایت تحصیل حاصل ہے۔

ج۔ لِلْمُتَّقِيْنَ میں لام تحقیق کا ہے نہ کہ غایت کا۔ یعنی حقیقت میں اس سے متقیوں کو ہدایت ملے گی یہ بات دوسری جگہ زیادہ واضح کردی گئی ہے هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (آل عمرانؔ) یہ بیان سارے انسانوں کے لئے ہے اور ہدایت اور نصیحت ہے در حقیقت متقیوں کے لئے۔

سؔ۔ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ۔ وہ اللہ کے ساتھ دھوکا کرتے ہیں۔ ناواقف کے ساتھ دھوکا ہوتا ہے۔ اللہ کا علم تو کامل ہے اس کے ساتھ کوئی کیا دھوکا کرے گا۔

ج۔ صحیح ہے۔ دراصل منافق اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرکے رسول اللہ اور مومنوں کو دھوکا دیتے تھے جس سے مقصد تھا رسالت کو ناکام بنانا جو من جانب اللہ

تھی۔اس لئے ان کا یہ فریب بالواسطہ اللہ کے ساتھ تھا۔

س۲۔ اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ۔ اللہ ان کے ساتھ تمسخر کرتا ہے۔تمسخر فعل ناپسندیدہ ہے جس سے اللہ کی ذات منزہ ہے۔پھر اس کو اپنی طرف کیوں منسوب فرمایا۔

ج۔ کبھی کبھی جرم ہی کا لفظ سزا کے لئے بھی استعمال میں آتا ہے۔یہاں اس کے معنی ہیں کہ اللہ ان کے تمسخر کی ان کو سزا دیتا ہے جس کا ذکر آگے ہے وَیَمُدُّھُمْ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ ۝ اور ان کو ڈھیل دیتا ہے کہ وہ اپنی شرارت میں بھٹکتے رہیں۔جیسے ہے نَسُوا اللّٰہَ فَنَسِیَھُمْ (توبہ۹) وہ بھول گئے اللہ کو تو اللہ بھول گیا ان کو۔حالانکہ اللہ بھولنے والا نہیں وَمَا کَانَ رَبُّکَ نَسِیًّا (مریم) بھول جانے کے معنی بھول کی سزا دینے کے ہیں جس کا بیان سورۂ حشر ع۳ میں ہے فَاَنْسٰھُمْ اَنْفُسَھُمْ۔ انہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں خود اپنے آپ کو بھلوا دیا۔یعنی وہ اپنی خودی کو بھول گئے۔یہی صورت ہے وَمَکَرُوْا وَمَکَرَ اللّٰہُ (آل عمران) فریب کیا کافروں نے اور اللہ نے ان کے فریب کی سزا ان کو دی۔

س۳۔ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ تم علم رکھتے ہوئے اللہ کے شریک نہ بناؤ۔کس بات کا علم؟ مشرکین تو یہی سمجھتے تھے کہ اللہ کے اور بھی شرکاء ہیں۔

ج۔ اس بات کا علم کہ جن کو تم اللہ کا شریک گردانتے ہو وہ کسی قسم کی قدرت نہیں رکھتے۔ لَا یَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِھِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا یَمْلِکُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَیٰوۃً وَّلَا نُشُوْرًا (فرقان) وہ نہ اپنے لئے برائی کرنے کی قدرت رکھتے ہیں نہ بھلائی کرنے کی۔نہ موت کے مالک ہیں نہ حیات کے اور نہ جی اٹھنے کے۔

سؔ۔ فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّہٖ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَیْہِ۔ آدمؑ نے چند کلمے اپنے رب سے سیکھے سو اللہ نے اس کی توبہ قبول فرمائی۔ آدم کی توبہ قبول ہوگئی تو جنّت سے کیوں نکالے گئے؟

ج۔ توبہ کی قبولیت کے معنی گناہ کی مغفرت کے نہیں ہیں بلکہ رجوع ہونے کے ہیں۔ آدم نے نافرمانی کے بعد جب مغفرت مانگی تو اللہ نے ان کی طرف توجہ فرمائی اور ہدایت کی، وَعَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى (طٰہٰ) آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور بھٹک گیا۔ پھر اس کے رب نے اس کو برگزیدہ کیا۔ اس کی توبہ قبول فرمائی اور ہدایت دی۔

س۔ عام مسلمانوں کا خیال یہی ہے کہ حضرت آدم کا گناہ معاف کر دیا گیا۔

ج۔ قرآن سے اس کا ثبوت نہیں۔ حضرت موسیٰ نے قبطی کو مار ڈالنے کے بعد دُعا کی رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ (قصص)، قرآن کہتا ہے فَغَفَرَ لَهٗ۔ اللہ نے اس کا گناہ بخشدیا۔ حضرت داؤد کے قصّہ میں ہے فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ (صٓ) اس نے اپنے رب سے مغفرت مانگی اور رکوع میں جھکا اور اس کی طرف رجوع ہوا۔ اللہ فرماتا ہے فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ہم نے اس کا قصور معاف کر دیا۔ اور حضرت آدم کو جب اُن کے گناہ پر ہبوط کا حکم دیا گیا انہوں نے عاجزی کے ساتھ اپنے قصور کا اعتراف کیا اور مغفرت چاہی مگر مغفرت نہیں ملی بلکہ پھر دوبارہ ہبوط ہی کا حکم دیا گیا۔

سؔ۔ یہاں اِهْبِطُوْا کا صیغہ جمع کا ہے سورۂ طٰہٰ میں اسی حکم کے لئے تثنیہ کا صیغہ اِهْبِطَا کیوں لایا گیا ہے؟

ج۔ اعتبارات کے اختلاف سے عبارت بدلی جاسکتی ہے۔ آدم۔ حوّا۔ ابلیس عدد کے لحاظ سے جمع ہیں مگر ناری و خاکی یعنی جن و انس کے لحاظ سے تثنیہ۔

س۔ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے۔ یہاں جمع مخاطب کی ضمیر کیوں لائی گئی۔ آدم و حوّا تو دو ہی تھے کیا ابلیس بھی اس میں شامل ہے؟

ج۔ ابلیس شقی ازلی ہے نجات سے مایوس۔ اس کے لئے ہدایت کیا آئے گی۔ یہاں خطاب ہے آدم و حوّا اور ان کی تمام ذریت سے جن سے ازل میں عہد اَلَستُ لیا گیا ہے۔

س۔ آدم کے متعلق اللہ نے فرمایا فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى جب آدم کو ہدایت دے دی تو پھر ہدایت بھیجنے کی ضرورت کیا باقی رہی؟

ج۔ آدم کو اُن کی ذات کے لئے فطری دین کی ہدایت دی گئی تھی کیونکہ اس وقت ان کی کوئی امت نہ تھی۔ اسی لئے قرآن میں ان کے واسطے رسول یا نبی کا لفظ نہیں آیا۔ لیکن دُنیا میں اُن کی ذریت سے قبیلے اور قبیلوں سے قومیں اور قوموں سے اُمتیں بننے والی تھیں اس لئے حسب ضرورت ہدایت بھیجنے کا وعدہ فرمایا۔

س۔ یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ہدایت آنے کی کیا صورت ہوگی؟

ج۔ یہاں اور سورۂ طٰہٰ میں صرف هُدًى کا لفظ ہے مگر سورۂ اعراف میں اسی قصہ آدم و ابلیس کے ذیل میں ہے یَا بَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِیْ اے بنی آدم اگر تمہارے پاس تمہیں میں سے رسول آئیں جو تم کو میری آیتیں پڑھ کر سُنائیں۔ یہ تشریح ہے کہ ہدایت آئے گی رسول اور کتاب کے ذریعہ سے۔

س۶ ۔ لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ ہم ہرگز ایک ہی کھانے پر صبر نہ کریں گے صرف ایک ہی نہیں بلکہ من وسلویٰ دو کھانے ان کو ملتے تھے۔

ج ۔ کھانے کی تعداد مراد نہیں ہے بلکہ یکسانیت ہے یعنی ہر روز ایک ہی قسم کی خوراک

س۷ ۔ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ وہ نبیوں کو ناحق قتل کر دیتے تھے۔ اُن کا قتل تو ہمیشہ ناحق ہی ہوگا پھر بِغَيْرِ الْحَقِّ کہنے کی کیا وجہ ہے؟

ج ۔ ان کے جُرم کی بُرائی کی مزید توضیح کے لئے۔

س۸ ۔ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ ہم نے ان سے کہا ذلیل بندرین جاؤ۔ بندر بن جانا ان کی طاقت سے باہر تھا۔ پھر ایسا حکم دینے کے کیا معنی ہوئے۔

ج ۔ یہ امر ایجابی نہیں بلکہ تکوینی ہے یعنی کُن فیکُون۔

س۱۰ ۔ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ پھر بجز تھوڑے لوگوں کے تم پھر گئے اور روگردانی کی۔ دونوں جملے ایک ہی مفہوم کو ظاہر کرتے ہیں۔

ج ۔ دو مفہوم الگ الگ ہیں۔ یعنی تم نے جو پیمان کیا تھا اس سے پھر گئے اور انجام پر نظر ڈالنے سے روگردانی کی۔

س۱۲ ۔ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ اور جو اُتارا گیا دو فرشتوں پر بابل میں یعنی ہاروت وماروت یہاں مَلَکَیْنِ سے بعض مفسروں نے دو فرشتہ سیرت بزرگ مراد لئے ہیں اور دلیل میں زنان مصر کا قول نقل کیا ہے جو انہوں نے حضرت یوسف کے متعلق کہا تھا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ (یوسف ع۳) اگر یہ صحیح ہو تو اس سے اس مشکل آیت کے حل میں مدد ملتی ہے۔

ج ۔ حضرت یوسف کے متعلق ہم کو معلوم ہے کہ وہ آدمی تھے ان کو مَلَک کہنا عصمت کے لحاظ سے استعارہ ہی کے طور پر ہوسکتا ہے۔ بخلاف اس کے ہاروت وماروت کے بارے میں کوئی ثبوت نہیں کہ وہ انسان تھے۔ پھر

حقیقی معنی سے عدول کیسے جائز ہو گا۔

س۱۲۔ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ اُن کو خوب معلوم ہے کہ جو اس کا خریدار ہو گا اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور بہت بُرا سودا ہے جس کے لئے انہوں نے اپنی جانیں بیچیں کاش وہ جانتے۔ پہلے تو موکد طریقہ پر فرمایا کہ اُن کو علم ہے پھر علم کی نفی کر دی۔ کیا یہ تضاد نہیں ہے ؟

ج۔ یہاں مثبت اور منفی دونوں علموں میں فرق ہے وہ خوب جانتے تھے کہ جادوگر آخرت میں بے نصیب ہو گا مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ اس کو کتنی سخت سزا ہوگی۔

س۱۳۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ہم جو آیت منسوخ کرتے یا بھلا دیتے ہیں اس سے بہتر یا ویسی ہی لا دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے کلام کو خود اس کے سوا دوسرا کوئی منسوخ نہیں کر سکتا۔

ج۔ بے شک۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جو آیتیں منسوخ ہوئی تھیں وہ نزولِ قرآن ہی کے زمانہ میں ہو چکیں کیونکہ وحی کا سلسلہ بند ہو جانے کے بعد آیت کے بدلے میں آیت نہیں مل سکتی۔ اس لئے نسخ بھی ممکن نہیں۔ جو لوگ دو آیتوں میں تعارض سمجھ کر ایک کو ناسخ دوسری کو منسوخ قرار دیتے ہیں وہ دراصل اُن کی فہم کا قصور ہوتا ہے۔ قرآن کی موجودہ آیات میں سے کوئی دو آیتیں باہم متعارض نہیں ہیں اور روایات سے آیات کو منسوخ کرنا تو قرآن پر ظلم ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خود یہ حق نہیں تھا کہ قرآن میں کسی قسم کی تبدیل کر سکیں قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ کہدے کہ مجھے حق نہیں کہ میں قرآن کو اپنے جی سے بدل سکوں[1]۔ (یونس ۱۵)

---

[1] نسخ آیات کی بحث ہم کئی جگہ خاص کر تاریخ القرآن میں مفصل لکھ چکے ہیں۔

س۱۶۔ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ وہ آخرت میں صالحین میں سے ہوں گے۔حضرت ابراہیم عظیم الشان رسول ہیں۔صالح ہونے سے ان کے شرف میں کیا اضافہ ہوگا۔

ج۔ یہاں صالح کا عام مفہوم مقصود نہیں ہے بلکہ حیات اُخروی کی صلاحیت رکھنے والا اور اس کا شرف تو وہیں معلوم ہوگا۔

س۱۶۔ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ اور نہ مرنا مگر اسلام کی حالت میں۔غیر اختیاری امر سے نہی کا کیا مطلب ہے؟

ج۔ یہ مطلب ہے کہ تم اسلام پر ثابت قدم رہنا مرتے دم تک۔یہ غیر اختیاری موت سے نہی نہیں بلکہ اختیاری ثبات کا امر ہے۔

س۱۷۔ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ۔ اور جس قبلہ پر تم تھے وہ ہم نے اسی لئے مقرر کیا تھا کہ جان لیں کہ کون رسول کے پیچھے چلتا ہے اور کون اُلٹے پاؤں پلٹ جاتا ہے۔علم الٰہی تو ہر شئے پر محیط ہے۔پھر یہاں جاننے کے کیا معنی ہیں۔

ج۔ یہاں علم کے معنی جانچنے کے ہیں اور یہ جانچ اللہ اپنے بندوں میں کرتا رہتا ہے۔سورۂ عنکبوت کے پہلے رکوع میں ہے فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ اللہ ضرور جانچے گا سچوں کو اور ضرور جانچے گا جھوٹوں کو۔

س۱۷۔ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ہم پھیر دیں گے تجھ کو اس قبلہ کی طرف جس سے تو راضی ہے۔کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کے قبلہ سے راضی نہ تھے؟ حالانکہ وہ بہ حکم الٰہی تھا۔

ج۔ راضی تھے لیکن رضائے تسلیم تھی۔رضائے طبعی کعبہ ہی کے ساتھ تھی۔

س۱۷۔ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ۔ تو اُن کے قبلہ کا ماننے والا نہیں۔یہود اور نصاریٰ کے دو مختلف قبلے ہیں۔یہاں ان کی طرف ایک ہی قبلہ کو کیوں منسوب کیا۔

ج۔ چونکہ وہ دونوں کعبہ سے مختلف ہیں اس لئے ان کی نوعیت ایک ہی ہے اور ایک ہی حکم میں ہیں۔

س ۱۸۔ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۔ تاکہ لوگوں کو تمہارے اُوپر حجت باقی نہ رہے تحویل کعبہ کو حجت سے کیا تعلق ؟

ج۔ یہود کہتے تھے کہ محمدؐ ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہمارے دین کو برحق سمجھتے ہیں۔ قبلہ بدل جانے سے ان کی یہ حجت جاتی رہی۔

س ۱۹۔ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ۰ جو کوئی اللہ کی راہ میں مارا جائے اس کو مردہ نہ کہو۔ وہ تو زندہ ہے لیکن تم کو یہ خبر نہیں۔ شہید کو تو سب ہی مردہ دیکھتے ہیں آخر سمع۔ بصر اور قلب سب کی شہادت کیسے غلط قرار دی جائے۔

ج۔ ہمارے علم کی دنیا بہت محدود ہے اسی لئے اللہ نے فرمایا کہ تم کو خبر نہیں ہے مرنے کے بعد ہر شخص کے آگے برزخ ہے وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ (مومنون ۱۰۰) اور ان کے آگے آڑ ہے اُٹھائے جانے کے دن تک۔ نہ ان کو حیات میسر ہے نہ رب کی حضوری لیکن شہید کو جان نکلتے ہی یہ دونوں چیزیں میسر ہو جاتی ہیں وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ۰ (آل عمران ۱۶۹) جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ان کو ہرگز مُردہ نہ خیال کرو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق پاتے ہیں۔ دراصل دُنیاوی موت شہیدوں کے تسلسل حیات کو منقطع نہیں کرتی ہے مگر ہمارا علم اس کے ادراک سے قاصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ان کو نہ صرف مردہ کہنے بلکہ مردہ گمان کرنے کی بھی ممانعت کی اور ہم کو اپنی طرف سے اُن کی زندگی کا علم عطا فرمایا۔

س¹⁹۔ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝ اُن کافروں پر لعنت ہے اللہ کی اور ملائکہ کی اور تمام آدمیوں کی۔ مگر ان کے ہم مذہب کہاں ان پر لعنت کرتے ہیں؟

ج۔ دنیا میں نہیں کرتے تو عقبیٰ میں کریں گے ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم بَعْضًا (عنکبوت ع³) پھر قیامت کے دن تم ایک دوسرے کی تکفیر کرو گے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے۔

س¹⁹۔ وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۔ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ یہاں الٰہ کے لفظ کو مکرر لانے سے کیا فائدہ ہے؟ یہی مطلب إِلَٰهُكُمْ وَاحِدٌ سے بھی نکل سکتا ہے۔

ج۔ مبتدا کا تکرار حصر کا فائدہ دیتا ہے۔ یعنی نصاریٰ تین خدا مانتے ہیں اور تمہارا معبود صرف ایک معبود ہے قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ میں بھی اسی غرض کے لئے مبتدا مکرر لایا گیا ہے۔

س²¹۔ مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ان منکروں کی مثال اس شخص کی ہے جو چلاتا ہے ان جانوروں پر جو سوائے آواز کے کچھ نہیں سنتے۔ کافروں کی تمثیل جانوروں کے ساتھ موزوں ہے نہ کہ چرواہے کے ساتھ۔

ج۔ جمع کی تمثیل مفرد کے ساتھ بتاتی ہے کہ یہاں اضمار ہے یعنی مَثَلُكَ مَعَ الَّذِينَ كَفَرُوا تیری مثال ان کافروں کے ساتھ ایسی ہے جیسی اس شخص کی جو بہائم کو آواز دے رہا ہو۔ یہی اضمار اس سورہ کے دوسرے رکوع میں ہے مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا یعنی مَثَلُكَ مَعَهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا (الآیۃ) تیری مثال ان منافقوں کے ساتھ ایسی ہے جیسے کسی نے آگ جلائی جب اس کا

ماحول روشن ہوگیا تو ان منافقوں کی آنکھوں کا نور اللہ نے لے لیا اور ان کو تاریکی میں چھوڑ دیا کچھ نہیں دیکھتے بہرے گونگے اندھے ہیں اس لئے نہیں پلٹیں گے۔

س ۲۱۔ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا۔ اللہ، یوم آخر۔ ملائکہ۔ کتاب اور انبیاء پر۔ کیا اجزاء ایمان میں تقدیر شامل نہیں ہے؟

ج۔ تقدیر قرآن کے لحاظ سے دیگر دینی حقائق کی طرح ایک حقیقت ہے ایمان کا جزو نہیں ہے[1]۔ دوسری آیت میں بھی یہی پانچوں اجزاء ہیں وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا۔ (نساء ع ۲۰)

س ۲۲۔ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى آزاد کے بدلہ میں آزاد۔ غلام کے بدلہ میں غلام۔ اور عورت کے بدلہ میں عورت۔ دوسری آیت میں قصاص کا قانون جان کے بدلہ جان بیان کیا گیا ہے۔

ج۔ وہ قانون یہود کے لئے تھا وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ (المائدہ ع ۷) ہم نے یہود کے اوپر توریت میں لکھا ہے کہ جان کے بدلہ جان۔ لیکن قرآن نے جو ہر زمان و مکان کے لئے نازل ہوا ہے اس کو بہت معتدل بنایا ہے۔

س ۲۳۔ اَلْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ قرآن نے یہ تاکیدی حکم دیا کہ والدین اور اقرباء کے لئے اپنے متروکہ میں سے ضرور وصیت کر جاؤ پھر فقہاء نے اس کو منسوخ کس دلیل سے کیا ہے؟

ج۔ حنفیہ نے حدیث لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ سے اس کو منسوخ کر دیا۔ کیونکہ ان کے

---

[1] تقدیر ایمان کا جزو زمانہ مابعد میں بنائی گئی تاکہ مستبد خلفاء کے مظالم کے خلاف امت کھڑی نہ ہو اور ان کو امر تقدیری سمجھ کر صبر کرتی رہے۔

اصول کے مطابق روایت آیت کو منسوخ کرسکتی ہے۔ اور شافعیہ نے جن کے یہاں حدیث سے آیت منسوخ نہیں ہوسکتی۔ آیات وراثت کو اس کا ناسخ قرار دیا ہے۔ حالانکہ خود انہیں آیات میں چار جگہ تصریح ہے کہ وراثت کا نفاذ وصیت کے بعد ہوگا۔[۱]

س۔ روزہ کے بیان میں مریض اور مسافر کا ذکر کیوں دہرایا گیا ہے۔

ج۔ پہلی آیت میں روزے کا مکمل حکم بیان کردیا کہ تندرست غیر مسافر روزہ رکھے۔ مریض اور مسافر کو رعایت ہے کہ وہ دوسرے دنوں میں ان کا شمار پورا کریں۔ اور جن کو روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو وہ فدیہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلایا کریں۔ دوسری آیت میں جب رمضان کا مہینہ روزہ کے لئے متعین فرمایا تو پھر مریض اور مسافر کی رعایت کو دہرادیا تاکہ شبہ نہ رہے کہ اس تعین کے بعد وہ باقی نہیں رہی لیکن جن کو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں ہے ان کے حکم کے دہرانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ تو روزہ رکھ ہی نہیں سکتے۔

س۱۳۔ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ جو دل کی خوشی سے خیرات کرے وہ اس کے لئے بہتر ہے۔ یہ فدیہ سے متعلق ہے یا صدقہ فطر کی تعلیم ہے؟

ج۔ یہ ہر اس خیرات سے متعلق ہے جو روزہ کے فدیہ یا رمضان کے مہینہ یا کسی زمانہ میں کی جائے۔ پیمانہ ہے اس کا دل کی خوشی۔ صدقہ فطر جو امت میں رائج ہے کہ عید سے کسی ایک دن پہلے گھر کے ہر فرد کی طرف سے خواہ وہ غیر مکلف

---

[۱] اس بحث کو ہم نے اپنی عربی تصنیف الوراثۃ فی الاسلام میں تفصیل کے ساتھ لکھ دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وراثت کا قانون کلی ہے۔ اس میں ورثہ کے شخصی مصالح کا لحاظ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لئے وصیت فرض کی گئی ہے اس کو منسوخ کرکے قرآن کی ایک اہم تعلیم ضائع کردی گئی ہے۔

بالشرع بچہ ہی کیوں نہ ہو چار مد عراقی کے پیمانہ سے غلّہ یا اس کی قیمت نکالتے ہیں۔ روایات کی تعلیم ہے قرآن کی نہیں ہے۔

س^{۲۳}۔ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔ مگر ساری دعائیں اور سب کی دعائیں کہاں قبول ہوتی ہیں۔

ج۔ اللہ کا قول سچا ہے۔ عدم قبولیت کے اسباب خود دعا کرنے والوں کی طرف سے ہوتے ہیں اس کا وعدہ یہی ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (مومن ۶۰) مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا۔

س^{۲۴}۔ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ کہہ دے کہ ہلال اوقات کا شمار ہیں لوگوں کے واسطے اور حج کے لئے۔ مواقیت کہہ دینے کے بعد حج کے ذکر کی کیا خصوصیت ہے۔

ج۔ ہلال سے مہینوں کا شمار کیا جاتا ہے اور حج سال میں ایک بار ہوتا ہے اس کے ذکر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دینی ماہ وسال دونوں قمری ہیں دنیاوی سال کو شمسی رکھنے کی ممانعت نہیں۔

س^{۲۴}۔ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ فِی الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ تین روزے حج میں اور سات واپسی کے بعد یہ ہوئے پورے دس۔ آخری فقرہ کی کیا ضرورت خاص ہوئی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ تین اور سات مل کر دس ہوتے ہیں۔

ج۔ واؤ کبھی یا کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (نساء ۱) نکاح میں لاؤ اپنی پسند کی عورتیں دو یا تین یا چار۔ یہاں بھی خیال ہو سکتا تھا کہ حج میں تین روزے یا واپسی کے بعد سات۔ اس شبہ کو مٹانے کے لئے حاصل جمع ذکر کر دیا گیا ہے۔

س^{۲۵}۔ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۔ اللہ کا

ذکر کرو مشعر حرام کے پاس اور ذکر کرو جیسا اس نے تم کو سکھایا ایک ہی جملہ میں ذکر کا حکم دو بار کیوں دیا گیا۔

ج۔ پہلے مطلق ذکر کا حکم ہے پھر ذکر کی نوعیت کا کہ قرآن کے مطابق ہونا چاہئیے۔

س ۲۶۔ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۰ قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ۰ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ کہدے کہ جو مال خرچ کرو وہ والدین اور اقرباء کے لئے کرو۔ یہاں سوال وجواب میں مطابقت نہیں معلوم ہوتی۔

ج۔ یہ سوال کا جواب ہی نہیں ہے۔ وہ تو بعد کی آیتوں میں دیا گیا ہے "قُلِ الْعَفْوَ" کہہ دے کہ جو بچت ہو۔ یہاں پوچھنے والوں کو اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ خیرات کی مقدار پوچھنے سے پہلے اس کا صحیح مصرف جاننا زیادہ اہم ہے۔

س ۲۵۔ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۰ اگر وہ طلاق کا ارادہ کریں تو اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔ ارادہ کیسے سنا جائے گا۔

ج۔ اللہ کو انسان پر قیاس نہیں کرنا چاہئیے۔ وہ جن وانس مرغ وماہی اور مور وملخ سب کے دلوں میں جو وسوسے گذرتے ہیں ان کو سنتا دیکھتا اور جانتا ہے۔

س ۳۲۔ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْیَاهُمْ اللہ نے ان سے کہا مر جاؤ۔ پھر ان کو زندہ کر دیا۔ کیا یہ غیر اختیاری بات کا حکم نہیں ہے۔ پھر موت کے بعد دنیا میں زندگی کیسی وہ تو قیامت میں نصیب ہوگی ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۰ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۰ (مومنون ع۱) پھر تم اس کے بعد مروگے پھر قیامت کے دن اٹھائے جاؤگے۔

ج۔ یہاں مُوْتُوْا سے مراد ہے۔ لڑ مرو جس کی تشریح آگے کی آیت وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں) کرتی ہے اور زندہ کر دیا کے معنی ہیں ان کو دشمنوں پر فتح دے کر قومی زندگی عطا فرمائی جس کا مفصل بیان بعد

کے رکوع میں ہے۔

س۳۴ ۔ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْہِ وَلَا خُلَّۃٌ وَّلَا شَفَاعَۃٌ ۔ اس دن نہ خرید ہوگی نہ دوستی نہ سفارش۔ قیامت کے دن شفاعت کی مطلق نفی کی گئی ہے حالانکہ قرآن کی مختلف آیتوں بلکہ خود اسی کے بعد آیۃ الکرسی سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

ج۔ ثبوت ملتا ہے شفاعت باذن الٰہی کا۔ لہٰذا ساری شفاعت اللہ ہی کے اختیار میں ہے قُلْ لِّلّٰہِ الشَّفَاعَۃُ جَمِیْعًا (الزمر ۵) کہہ دے کہ ساری شفاعت اللہ ہی کے لئے ہے۔ یہاں نفی غیر اللہ کی شفاعت کی ہے۔

س۳۶ ۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی ۔ اے مومنو! اپنی خیرات کو احسان رکھ کر اور ستا کر ضائع نہ کرو۔ لیکن اللہ نے خود جابجا اپنے احسانات جتائے ہیں۔ مثلاً لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ ۔ بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ

ج۔ یہ لفظ جہاں کہیں بھی اللہ کی شان میں آیا ہے اس کے معنی عطا و بخشش کے ہیں احسان جتانے کے نہیں ہیں۔ اس کی صفت منّان ہے یعنی احسان کرنے والا نہ کہ رکھنے والا۔

س۳۸ ۔ اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۔ تجارت سود کی طرح ہے۔ ان کو کہنا چاہیئے تھا کہ سود تجارت کی طرح ہے کیونکہ بحث اسی کے بارے میں ہے۔

ج۔ یہ مبالغہ کا طریق ہے۔ یعنی سود کی حلّت کا ان کو اس قدر یقین تھا کہ اسی کو اصل اور تجارت کی حلّت کو فرع قرار دیا۔

س۔ قرآن نے اس موقع پر ربا کی حرمت کی کوئی وجہ نہیں ظاہر کی۔

ج۔ وہ خود ربا کے لفظ میں موجود ہے۔ اس کے معنی ہیں خالص بڑھتی۔ سودخوار صرف نفع لیتا ہے نقصان میں شرکت نہیں کرتا۔ اس لئے وہ ناجائز ہے۔ اگر باختیار خود نقصان میں بھی شرکت کرے تو پھر حرمت کی وجہ باقی نہیں رہتی۔

س۳۸۔ فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ سود خوار کے ساتھ اللہ و رسول کی طرف سے جنگ کا اعلان کر دو۔ مگر وہ تو کلمہ گو ہیں اور فرائض شرعی بھی ادا کرتے ہیں۔

ج۔ کفار کی طرح نہیں بلکہ قانون توڑنے والوں کی طرح۔ یعنی حکومت سود خواروں کی سزا کے لئے قانون بنائے گی۔

س۳۹۔ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ جب تم لین دین کرو آپس میں قرض کا تَدَايَنتُم کے بعد دَین کا لفظ کیوں لایا گیا۔ یہ لفظ تو خود دین ہی سے نکلا ہے۔

ج۔ اس کے آگے ہے فَاكْتُبُوهُ یعنی اس کو لکھ لیا کرو۔ یہ واحد غائب کی ضمیر دَین کی طرف راجع ہے۔ اگر پہلے فقرہ میں دَین کا لفظ نہ ہوتا تو اس کو یہاں لانا پڑتا۔ پھر عبارت اتنی حسین نہ ہوتی۔

س۴۰۔ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ جو شہادت کو چھپائے اس کا قلب گنہگار ہے گناہ کو خود اس کی طرف منسوب کیوں نہ فرمایا۔

ج۔ کتمان کا تعلق قلب سے ہے۔ اس لئے اس کے ضمیر کو مجرم قرار دینا بہ نسبت اس کے زیادہ بلیغ ہے۔

س۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ۔ ہم اس کے رسولوں میں ایک دوسرے کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ کیا سب کا درجہ برابر ہے؟

ج۔ درجہ کے لحاظ سے رسول اور رسول میں فرق ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ (البقرہ ۳۳) ان رسولوں میں سے ایک کو دوسرے پر ہم نے فضیلت دی ہے۔ اسی طرح نبی اور نبی میں بھی وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَىٰ بَعْضٍ (بنی اسرائیل ۶) اور ہم نے فضیلت دے رکھی ہے ایک نبی کو دوسرے نبی پر۔ لیکن ایمان لانے میں سب برابر ہیں۔ یعنی سارے رسولوں اور نبیوں کے برحق ہونے پر ہم یکساں ایمان رکھتے ہیں۔

سُورہ آلِ عمران

س - اٰیَاتٌ مُّحْکَمَاتٌ ھُنَّ اُمُّ الْکِتَابِ وَاُخَرُ مُتَشَابِہَاتٌ - آیات محکمات۔ وہی اصل کتاب ہیں اور دوسری متشابہات ہیں۔ ان دونوں قسموں کی آیات کے بارے میں مفسرین کے اس قدر اختلافات ہیں کہ ان کی حقیقت متعین نہیں ہوتی۔

ج۔ محکمات کے معنی ہیں پختہ۔ یہ واضح اور کھلی ہوئی آیتیں ہیں جن کے معانی سمجھ میں آتے ہیں اور یہی نزول قرآن سے اصل مقصود ہیں لیکن دینی ضرورت سے کچھ باتیں قرآن نے ایسی بھی بیان کی ہیں یا اس کو بیان کرنی پڑی ہیں جو دنیا میں انسانوں کی علمی دسترس سے باہر ہیں۔ مثلاً اللہ کی ذات۔ صفات۔ بعث بعد الموت۔ حساب کتاب۔ میزان عمل جنت دوزخ وغیرہ۔ انسانی مدرکات خواہ ظاہری ہوں یا باطنی ان کے ادراک سے دنیا میں قاصر ہیں۔ اس لئے یہ تمثیلی طور پر ایسے الفاظ میں بیان کی گئی ہیں جو ہماری بول چال کے الفاظ سے ملتے جلتے اور مشابہ ہیں۔ جن کے ذریعہ سے ان غیر مُدرک حقائق کا ایک تصوّر ہمارے ذہنوں میں قائم ہو جاتا ہے چونکہ ان آیات سے عمل نہیں بلکہ صرف ان حقائق پر ایمان رکھنا مقصود ہے۔ اس لئے ان کی تفصیل کی ضرورت بھی نہیں محض اجمالی علم کافی ہے۔ چنانچہ قرآن ان لوگوں کو فتنہ پرداز قرار دیتا ہے جو ان کی تاویل کے پیچھے پڑتے ہیں۔

س - یہاں محکمات اور متشابہات دو قسم کی آیتیں بتائی گئی ہیں اور سورہ ہود کی پہلی آیت ہے کِتَابٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ ۝

عظیم الشان کتاب جس کی آیات محکم بتائی گئیں۔ پھر ان کی تفصیل حکمت اور خبر رکھنے والے اللہ کی طرف سے کی گئی جس سے خیال ہوتا ہے کہ جملہ آیات محکمات ہی ہیں۔

ج۔ بیشتر آیات محکمات ہی ہیں۔ انہیں کا بیان ذکر ہے کہ ان کی تفصیل اللہ ہی نے کردی ہے متشابہات کا ذکر اس لئے چھوڑ دیا کہ وہ تفصیل طلب نہیں ہیں در اصل سورہ ہود کی اس آیت میں یہ بات بتانی مقصود ہے کہ قرآن کی آیات کی تفصیل قرآن ہی میں موجود ہے۔ ان کے لئے کسی دوسری تفسیر کی حاجت نہیں ہے۔

س۱۔ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۔ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ اس کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا جو پختہ علم والے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ بعض مفسروں نے الراسخون کو اللہ کا معطوف قرار دیکر یہ معنی بیان کئے ہیں کہ متشابہات کی تاویل اللہ بھی جانتا ہے اور جو لوگ علم میں پکے ہیں وہ بھی جانتے ہیں۔ نیز بعض بزرگوں کی طرف ان کے جاننے کا دعویٰ بھی منسوب کیا ہے۔

ج۔ پہلے بیان کر دیا گیا کہ آیات متشابہات میں وہ امور بیان کئے گئے ہیں جن کی تاویل اس دنیا میں انسان کی علمی دسترس سے باہر ہے اگر کسی نے ان کے علم کا دعویٰ کیا ہے تو یا تو اس نے قرآن کو نہیں سمجھا ہے یا اپنے آپ کو۔

س۲۔ يَرَوْنَهُم مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ وہ اُن کو اپنے سے دُگنا دیکھتے تھے چشم دید کون کس کو دُگنا دیکھتا تھا؟۔

ج۔ جنگ بدر میں دونوں فریق جب آمنے سامنے آگئے اس وقت مسلمانوں کی تعداد ۳۱۳ تھی اور قریش کی ایک ہزار۔ اللہ نے مسلمانوں کی آنکھوں میں دشمنوں کی تعداد کم دکھائی اور دشمنوں کی آنکھوں میں مسلمانوں کو کم دکھایا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمان قریش کو اپنے سے دُگنا دیکھتے تھے اور خود ان کی تعداد سے

کم۔ کیونکہ وہ مسلمانوں سے تگنے سے بھی زیادہ تھے اور قریش کی آنکھوں میں مسلمان اپنی اصلی تعداد سے بھی کم نظر آتے تھے۔ اس کا ذکر سورہ انفال میں بھی آئے گا۔

سؔ۔ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ اور بیٹا بیٹی جیسا نہیں ہے۔ عمران کی بیوی امید رکھتی تھی کہ اس کے شکم سے بیٹا پیدا ہوگا جس کو وہ ہیکل[1] کی خدمت کیلئے نذر کرے گی۔ مگر پیدا ہوئی بیٹی۔ ایسی صورت میں اس کو کہنا چاہئیے تھا کہ بیٹی بیٹے جیسی نہیں ہے لیکن یہاں جملہ برعکس ہے۔

ج۔ بالعموم مفسّروں نے اس کو عمران کی بیوی ہی کا قول قرار دیا ہے۔ اس صورت میں اعتراض وارد ہوتا ہے۔ مگر دراصل یہ عمران کی بیوی کا قول نہیں ہے بلکہ اللہ کے قول کا تتمہ ہے وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ یعنی اللہ کو خوب معلوم ہے جو کچھ وہ جنی ہے اور وہ بیٹا جس کی یہ آرزو رکھتی تھی اس بیٹی جیسا نہیں ہے جس کو یہ جنی ہے۔ کیونکہ اس بیٹی کو اللہ بیٹوں سے بھی بڑا رتبہ دے گا اور اس کو اور اس کے بیٹے کو دنیا والوں کے لئے اپنی نشانی بنائے گا وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعَالَمِينَ ۝ (انبیاء ۹۱)

سؔ۔ فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ ذکریا کو فرشتوں نے اس حالت میں پکارا جب کہ وہ محراب میں نماز پڑھ رہا تھا۔ نماز کی حالت میں پکارنا فرشتوں نے کیسے جائز رکھا؟

ج۔ صلوٰۃ کے معنی دعا کے بھی ہیں۔ ملائکہ نے ان کو اس وقت پکارا جب وہ محراب

---

[1] یہ مسجد بنی اسرائیل کے لئے حضرت سلیمان نے حضرت عیسیٰ کی میلاد سے ایک ہزار ایک برس قبل بنائی تھی۔ یہ شاہانہ تعمیر تھی جس کی نظیر اس زمانہ میں سارے عالم میں نہ تھی یہی مسجد ہیکل کے نام سے بنی اسرائیل میں مشہور ہوئی۔

ہیں کھڑے ہوئے (غالباً بیٹے کے لئے) اللہ سے دعا کر رہے تھے۔

سؐ ۔ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اللہ نے تجھ کو پسند کیا اور پاک کیا اور چن لیا سارے جہان کی عورتوں پر۔ ایک ہی جملہ میں اِصْطَفَاكِ لفظ کو دوبار لانے کی کیا ضرورت ہوئی؟

ج ۔ پہلے سے مراد ہے کہ باوجود لڑکی ہونے کے تجھ کو ہیکل کی خدمت کے لئے قبول فرما لیا۔ اور دوسرے سے دنیا کی عورتوں پر امتیاز کا شرف۔

سؐ ۔ اِسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اس کا نام ہوگا مسیح عیسیٰ ابن مریم بیٹے کی بشارت حضرت مریم ہی کو دی گئی۔ پھر اس کے نام میں ابن مریم لگانے کی کیا ضرورت ہوئی؟

ج ۔ بیٹے باپوں کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں نہ کہ ماؤں کی طرف۔ اس لئے ابن مریم کہتے ہیں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوں گے۔

سؐ ۔ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا لوگوں سے کلام کرے گا گود میں اور پوری عمر کو پہنچنے پر۔ ان دونوں زمانوں کو کلام کے لئے مخصوص کرنے میں کیا رمز ہے؟

ج ۔ پیدا ہونے کے ساتھ ہی کسی بچہ نے کلام نہیں کیا۔ یہ خصوصیت تھی حضرت عیسیٰ کی کہ اللہ نے روح القدس سے ان کی مدد کی اور وہ پیدائش کے بعد ہی بولنے لگے اور اس کی بدولت اپنی عزت اور اپنی والدہ کے ناموس کو بچا لیا اور کَهْلًا سے غالباً مقصود ہے ان کا دوبارہ دنیا میں آکر نبوت کرنا۔

سؐ ۔ إِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ میں تجھے وفات دوں گا اور اپنے پاس اُٹھاؤں گا۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کو وفات دے کر اللہ نے اُٹھا لیا۔

ج ۔ یہاں عطف تفسیری ہے معنی یہ ہوئے کہ میں تجھ کو وفات دوں گا یعنی اپنے پاس اُٹھاؤں گا جس طرح اُن کی ولادت غیر معمولی تھی بلا باپ کے۔ اسی طرح اُن کی وفات بھی غیر معمولی ہوئی بلا موت کے۔ دو فقرے جب ہم معنی ہوتے

ہیں تو اُن کے درمیان واؤ تفسیری کے لئے ہوتا ہے۔ سورۂ طٰہٰ کی آخری آیت ہے فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى تم کو جلد معلوم ہو جائے گا کہ کون سیدھے راستہ پر ہے یعنی کون ہدایت یافتہ ہے یہی وجہ ہے کہ سورۂ نساء ع۲۲ میں وفات کا لفظ نہیں صرف رفع کا ہے وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ انہوں نے یقین کے ساتھ عیسیٰ کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے اس کو اپنے پاس اُٹھا لیا۔

س۶۔ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ۔ عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی مثال ہے۔ یہ کیسے؟ عیسیٰ روح اللہ ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے عیسیٰ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے اور آدم ماں کے بغیر۔

ج۔ یہاں مماثلت کلی مقصود نہیں ہے۔ بلکہ صرف دونوں کے بلا باپ کے پیدا ہونے میں ہے۔

س۸۔ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ۔ کہہ دے ہدایت اللہ کی ہدایت ہے۔ یہی جملہ سورہ بقرہ ع۱۴ میں حصر کے ساتھ ہے قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى یہاں حصر کیوں نہیں؟

ج۔ یہاں بھی مبتدا اور خبر کی وحدت سے حصر کا فائدہ حاصل ہوتا ہے اس لئے دونوں جملوں میں معنی کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ یہی جملہ حصر کے ساتھ سورۂ انعام ع۹ میں بھی ہے اور مفہوم اس کا یہ ہے کہ ہدایت اللہ کے سوا کسی کے پاس نہیں ہے۔ نبی اور رسول کو بھی اللہ ہی ہدایت دے کر داعی الی اللہ اور سراج منیر بناتا ہے خود اُن کی ذات میں ہدایت نہیں ہوتی۔ رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآن میں اعلان کرایا گیا ہے قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِيْ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ (سباء ع۶) کہہ دے کہ اگر میں غلطی کروں

گا تو اپنے نفس کے باعث اور اگر سیدھے راستہ پر چلوں گا تو اس وحی کی بدولت جو میرا رب مجھ پر اتارتا ہے۔

۸ س۔ مَاكَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۔ کسی بشر کو جسے اللہ کتاب اور نبوت دے یہ حق نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے سوا میرے محکوم بنو۔ بلکہ اللہ والے بنو۔ اسی کے مطابق جو تم کتاب پڑھتے پڑھاتے ہو جسے اللہ کتاب شریعت اور نبوت دے سے مراد کون لوگ ہیں۔ اس کی تاویل میں اختلافات ہیں۔

ج۔ اس سے مراد انبیاء ہیں شریعت اور نبوت اُن کے سوا اور کس کو ملتی ہے سورۂ انعام ع۱۰ میں بہت سے نبیوں کے نام لینے کے بعد فرمایا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب شریعت اور نبوت عطا فرمائی۔

۱۰ س۔ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ ہے جو مکہ میں ہے۔ برکت والا اور اہل جہان کے لئے ہدایت۔ تعمیر کعبہ سے پہلے ہزاروں بستیاں انسانوں نے بسا رکھی تھیں اور لاکھوں گھر تھے۔

ج۔ یہاں بیت سے مراد ہے قبلہ۔ کعبہ سے پہلے دُنیا میں اللہ کی عبادت کے لئے کوئی قبلہ نہیں تھا۔ اس کے قبلہ ہونے کا ثبوت مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ کے الفاظ ہیں جو اس کی صفت میں کہے گئے ہیں۔

۱۱ س۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ تم بہترین قوم تھے یہ کیوں نہ کہا گیا اَنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ تم

بہترین امت ہو۔

ج۔ یہاں کُنْتُمْ حال کے معنی میں ہے اور اس کا مفہوم بھی وہی ہے جو اَنْتُمْ کا ہے فرق یہ ہے کہ اَنْتُمْ کہنے سے یہ صفت عارضی اور جدید ہوتی اور کُنْتُمْ سے اصلی اور علم الٰہی میں اس کے قدیم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

س ۱۴۱۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً اے مومنو نہ کھاؤ سود دونے پر دونا۔ کیا اس سے کم کھا سکتے ہیں؟

ج۔ سورہ بقر میں سود کو مطلقاً حرام کردیا۔ اس لئے اس کی مقدار کی کمی بیشی کا کوئی سوال باقی نہیں رہا۔ یہاں تو سود کی برائی دکھائی گئی ہے کہ وہ بڑھتی ہوئی دگنی بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے نرخ سود کم رکھنے سے فرق صرف یہ پڑے گا کہ زیادہ مدت میں دوگنی ہوگی۔

س ۱۴۱۔ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ کون گناہوں کو معاف کرتا ہے اللہ کے سوا دوسری آیت میں ہے قُلْ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا (جاثیہ ۲) کہہ دے مومنوں سے کہ معاف کردیں الآیہ۔ ان میں تعارض کا وہم ہوتا ہے۔

ج۔ اللہ کی مغفرت کے معنی ہیں گناہوں کے نتیجے سے بری کردینا۔ اور بندوں کو جو مغفرت کا حکم ہے اس کے معنی صرف نظر انداز کر دینے کے ہیں۔

س ۱۴۲۔ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ وہ درجے رکھتے ہیں اللہ کے یہاں۔ جنتیوں کے لئے درجات مگر جہنمیوں کے لئے درکات مناسب ہے۔ یہاں دونوں کے لئے درجات بولا گیا ہے۔

ج۔ یہاں ان مدارج کی بھلائی یا برائی ظاہر کرنی مقصود نہیں ہے بلکہ عمل کے لحاظ سے درجے وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (احقاف ۲) اور ہر ایک کے درجے ہیں ان کے عمل کے مطابق۔

س[19] ۔ وَقَتْلَهُمُ الْاَنْبِيَاءَ اور یہود کا نبیوں کو قتل کر ڈالنا۔ جو یہود نزول قرآن کے زمانہ میں تھے انہوں نے تو کسی نبی کو قتل نہیں کیا تھا۔

ج ۔ یہاں یہود کے شخصی نہیں بلکہ قومی جرائم شمار کئے گئے ہیں۔ انہوں نے خود تو نہیں قتل کیا تھا۔ مگر اپنے بزرگوں کے قتل انبیاء سے راضی تھے۔ اس لئے مجرم تھے۔

س[20] ۔ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ تو نے جس کو جہنم میں داخل کردیا اس کو خوار کر دیا۔ دوسری جگہ ہے لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ (تحریم ۱۰) اللہ نبی اور مومنوں کو خوار نہیں کرے گا۔ اس سے خارجی اور معتزلی عقیدہ کی تائید ہوتی ہے کہ کوئی مومن دوزخ میں نہیں جائے گا۔

ج ۔ یہ فرقے اعمال صالحہ کو بھی اجزاء ایمان مانتے ہیں۔ اس لئے مومن سے ان کی مراد مومن کامل ہے جس کے دوزخ میں جانے کا کوئی بھی قائل نہیں۔ رہے گنہگار مسلمان تو اُن کو باختلاف عقائد یہ کافر یا فاسق قرار دے کر دوزخ میں دھکیل دیتے ہیں۔ لیکن جمہور اہل اسلام ان کی مغفرت کی امید رکھتے ہیں۔ کیونکہ قرآن بشارت دیتا ہے لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (الزمر ۵۳) اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔

س[21] ۔ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ۔ روئے زمین میں کفار کا تصرف تجھ کو دھوکہ میں نہ ڈالے۔ رسول اعظم کافروں کے دنیاوی جاہ و حشم سے دھوکے میں کیسے پڑ سکتے تھے۔ اس لئے نہی کا مطلب واضح نہ ہوا۔

ج ۔ یہ نہی رسول کے ذریعہ سے اُمت کے لئے ہے جیسے لَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ وغیرہ۔

سورۂ نساء

س۔ خَلَقَکُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا۔ زوج کا لفظ شوہر اور بیوی دونوں کے لئے مستعمل ہے۔ سورہ اعراف میں ہے وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا یہاں زوج کے لئے مذکر کا صیغہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آدم ہیں نہ کہ حوّا۔ یعنی حوّا سے آدم کی تخلیق ہوئی نہ کہ آدم سے حوّا کی۔

ج۔ خَلَقَکُمْ میں ضمیر مخاطب جمع لا کر یہ بات واضح کر دی کہ یہاں فرد مراد نہیں ہے بلکہ جنس ہے جس کے اندر مذکر اور مونث سب داخل ہیں۔

س۔ عام عقیدہ کے مطابق اگر حوّا آدم سے پیدا ہوئیں تو وہ ہماری بہن ہوئیں نہ کہ ماں

ج۔ ہماری مائیں بھی تو آدم ہی کی اولاد ہیں۔ علاوہ ازیں حوّا کی تخلیق بطریق ولادت نہ تھی کہ اولاد کہی جائیں۔

س۔ لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَى أَمْوَالِكُمْ یتیموں کا مال نہ کھاؤ اپنے مال کے ساتھ یتیم کے مال کا کسی طرح بھی کھانا حرام ہے۔ پھر اپنے مال کے ساتھ کی شرط کس فائدہ کے لئے ہے؟

ج۔ عام طور پر ہوتا یہی تھا کہ ولی یتیم کو مع اس کے مال کے اپنے ساتھ شامل کر لیتا تھا اور دونوں کے مال مخلوط ہو جاتے تھے۔ ورنہ یہ شرط نہیں ہے جیسا کہ آگے فرمایا ہے کہ جو لوگ یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ کو آگ سے بھرتے ہیں۔

س۔ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً اگر تم کو ڈر ہے کہ بیویوں میں عدل نہ

کرسکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو۔ پھر اسی سورہ کے رکوع ۱۹ میں ہے وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ اور تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے کہ عدل رکھ سکو بیویوں کے درمیان۔ لہٰذا ایک دم جھک نہ جاؤ۔ پہلی آیت سے عدل کا امکان معلوم ہوتا ہے مگر دوسری آیت اس کو ناممکن بتاتی ہے۔ یہاں تعارض کا وہم ہوتا ہے۔

ج۔ سیاق و سباق پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت میں حقوق کا معاملہ ہے جس میں انسان عدل رکھ سکتا ہے۔ اور دوسری آیت میں قلبی محبت کا جس میں انسان بے بس ہے اور یہ نکتہ فلا تمیلوا سے واضح ہوتا ہے کیونکہ میلان افعال قلب میں سے ہے۔

س۔ وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ۔ یتیموں کو سدھارتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ کیا بلوغ سے قبل نکاح ناجائز ہے؟

ج۔ جائز اور ناجائز کا ذکر نہیں۔ بلوغ سے قبل فطرتاً انسان کو نکاح کی ضرورت نہیں اور قرآن غیر فطری امر کی تعلیم نہیں دیتا۔ علاوہ بریں بلوغ سے قبل جب خود اس کا مال اس کے سپرد نہیں کیا جا سکتا تو دوسرے کی بیٹی کی جان کیسے اس کی سپردگی میں دی جائے گی۔ فقہا نے نکاح صغیرہ کا استدلال قرآن کے صرف ایک لفظ سے کیا ہے جو سورہ طلاق میں ہے اور وہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ وہیں پہنچ کر اس کی توضیح کی جائے گی۔

س۔ فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ۔ اگر بیٹیاں ہوں دو سے اوپر تو ان کو متروکہ کا دو ثلث ملے گا۔ دو بیٹیوں کو بھی دو ثلث ملتا ہے پھر یہاں دو سے اوپر کہنے میں کیا نکتہ ہے۔ مفسرین آج تک اس کا صحیح حل نہیں بتا سکے ہیں نہ فقہا۔

ج- اولاد کو جس انداز سے قرآن نے بیان کیا ہے ان کی سات صورتیں ہو سکتی ہیں جن میں سے صرف تین کے حصے اس نے بیان کئے ہیں۔ بقیہ کو چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ انہیں تینوں سے ان کے حصے بھی نکل سکتے ہیں۔ وہ صورتیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) بیٹا بیٹی ملے جلے	بیٹے کو بیٹی سے دُگنا
(۲) ایک بیٹی	نصف
(۳) دو بیٹیاں	....
(۴) دو سے زائد بیٹیاں	دو ثلث
(۵) ایک بیٹا	....
(۶) دو بیٹے	....
(۷) دو سے زائد بیٹے	....

پہلی صورت سے معلوم ہو گیا کہ بیٹے کو بیٹی سے دُگنا ملتا ہے دوسری صورت میں بیٹی ایک ہے۔ اس کو نصف ملا ہے۔ پانچویں صورت میں جہاں بیٹا ایک ہے بیٹی سے دُگنا لے گا یعنی کل ترکہ کا وارث ہو گا۔ جب ایک بیٹا کل ترکہ کا وارث ہے تو دو یا دو سے زائد بیٹے بھی بحصہ مساوی کل کے وارث ہوں گے۔ اب صرف دو بیٹیوں کا مسئلہ رہ جاتا ہے وہ اس طرح سمجھ میں آ جاتا ہے کہ اگر ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہو تو پہلی صورت کے مطابق بیٹے کو $\frac{2}{3}$ اور بیٹی کو $\frac{1}{3}$ حصہ ملے گا۔ جب بیٹی ایک بیٹے کے ساتھ جوتی وارث ہے۔ $\frac{1}{3}$ پاتی ہے تو ایک بیٹی کے ساتھ بھی ضرور $\frac{1}{3}$ پائے گی۔ اس لئے دو بیٹیوں کا حصہ $\frac{2}{3}$ ہو گا۔ زیادہ اس لئے نہیں پا سکتی کہ قرآن نے دو سے زائد بیٹیوں کا حصہ $\frac{2}{3}$ رکھ دیا ہے اگر اس کو زائد دیا جائے تو دو بیٹیوں کا حصہ تین بیٹیوں سے زائد ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے فوق اثنتین کہا۔ اگر صرف اثنتین کہہ دیتا تو دو سے زائد بیٹیوں کا

حصہ سمجھ میں نہ آتا اور اس کو الگ بیان کرنا پڑتا۔

س۔ وَاِنْ کَانَ رَجُلٌ یُّوْرَثُ کَلٰلَۃً اَوِامْرَاَۃٌ وَّلَہٗٓ اَخٌ اَوْاُخْتٌ فَلِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا السُّدُسُ اور اگر کوئی مرد وارث بنایا جائے کلالہ کا یا کوئی عورت اور اس کے بھائی یا بہن ہو تو ان میں سے ہر ایک کو ۱/۶ حصہ دیا جائے گا۔ اس آیت میں فقہا نے حضرت ابی بن کعب سے ایک قرأۃ اَخٌ اَوْاُخْتٌ کے بعد لِاُمٍّ روایت کرکے مادری بہن بھائی مراد لئے ہیں اور ان کو ذوالفرض میں داخل کیا ہے۔ کیا شاذ قرأتوں سے قرآن پر اضافہ ہو سکتا ہے؟

ج۔ یہ قرات بمقابلہ قرأت متواترہ کے بالاتفاق تمام اُمت کے نزدیک نامقبول ہوئی اور کسی نے لِاُمٍّ نہیں پڑھا۔ اس سے استدلال کرنا اس کو ایک ساتھ ہی نامقبول اور مقبول دونوں قرار دینا ہے۔ تقسیم ترکہ کے اصول چونکہ حسابی ہیں اس لئے اس میں غلطی بداہتاً ظاہر ہو جاتی ہے مثلاً

ترتیب مسئلہ

شوہر	ماں	دو مادری بھائی	دو حقیقی بھائی
۳	۱	۲	محروم

مادری بھائی جو ممکن ہے کہ خاندان سے نہ ہوں اور ماں ان کو کسی دوسری جگہ سے لائی ہو وہ تو حصہ دار ہو جائیں اور حقیقی بھائی محروم رہیں۔ یہ کیونکر عقل گوارا کر سکتی ہے۔ اس لئے کہ حقیقی بھائی بھی تو اسی ماں سے ہیں۔ پھر باپ کی وجہ سے تو ان کا رشتہ اور بھی قوی ہو گیا ہے۔ لہٰذا فقہا کا یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ دراصل یہاں بھائی اور بہن کے حصے ہی نہیں بیان کئے گئے ہیں وہ تو اس سورۃ کی آخری آیت میں ہیں۔ یہاں عہدی وارثوں کا حصہ ہے۔ جن کا ذکر اسی سورۃ کے چوتھے رکوع میں ہے۔ وَالَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ فَاٰتُوْھُمْ نَصِیْبَھُمْ اور

جن سے تم نے عہد کر لیا ہو اُن کو اُن کے حصّے دو۔ اس آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے۔

اگر کوئی مرد کسی کلالہ (جس کے ماں باپ اور اولاد نہ ہوں) کا وارث بنایا جائے یا کوئی عورت بحالیکہ اس کلالہ کے کوئی بھائی یا بہن ہو تو اس مرد یا عورت میں سے ہر ایک کا حصہ ایک سدس ہو گا۔

بھائی اور بہن کا ذکر یہاں اس لئے کیا گیا ہے کہ معلوم ہو جائے کہ والدین یا اولاد کی طرح عہدی ورثہ کو وہ محروم نہیں کرتے[1]

س ۳۔ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ توبہ کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ ان لوگوں کے لئے ہے جو نادانستگی میں گناہ کر بیٹھتے ہیں۔ کیا دانستہ گناہ کرنے والے کی توبہ قبول نہیں ہوتی ؟

ج۔ یہاں اور سورۂ انعام ۶ پھر سورہ نحل ۱۶ میں تصریح کی گئی ہے کہ لاعلمی میں جو گناہ ہو جائے اللہ اس سے توبہ قبول کر لیتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہاں یہ بھی تصریح ہے کہ جان بوجھ کر جو شخص گناہ کرتا جاتا ہے اور موت کے وقت توبہ کرتا ہے اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ اب ان دونوں کے درمیان گناہ کی جو صورتیں ہیں ان سے توبہ کی قبولیت کا نہ وعدہ ہے نہ عدم قبولیت کا اظہار مگر مغفرت کی اُمید جابجا دلائی گئی ہے۔

س ۵۔ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ تم نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق۔ مگر یہ کہ تجارت ہو باہمی خوشی سے

تجارت کے علاوہ ہبہ، صدقہ، خیرات اور ضیافت وغیرہ کا مال کھانا بھی

---

[1] اس مسئلہ کو مدلل طریقہ سے ہم نے اپنے رسالہ محجوب الارث میں لکھ دیا ہے جو کئی بار شائع ہو چکا ہے نیز الوراثۃ فی الاسلام میں بھی۔

حلال ہے پھر تجارت کی کیا خصوصیت ہے ؟
ج ۔ اس لئے تجارت کا نام لیا گیا کہ رزق کے سامان کا بڑا ذریعہ وہی ہے جس پر دوسرے حلال ذرائع قیاس کئے جا سکتے ہیں ۔ فہرست کی ضرورت نہیں ۔
س۸ ۔ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا جب جہنمیوں کی کھالیں پک جائیں گی دوسری کھال بدل دیں گے ۔ وہ دوسری کھال تو معصوم ہو گی کس گناہ میں جلائی جائے گی ؟
ج ۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ کھالوں کی تبدیلی کس طرح ہو گی ۔ یہ آیت متشابہات میں سے ہے اس پر جو بحثیں کی گئی ہیں محض طفلانہ ہیں ۔
س۹ ۔ أُولَٰئِكَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ۔ عام بول چال میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف بڑھتے ہیں ۔ یہاں برعکس ہونے کی کیا وجہ ہے ؟
ج ۔ کوئی ضروری نہیں ہے اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف بھی اترتے ہیں اور چونکہ ہر مسلمان کو سورہ فاتحہ میں سکھایا گیا ہے کہ ان حضرات کے راستہ کی دعا مانگے اس لئے مزید ترغیب کے لئے یہی طرز بیان یہاں مناسب ہے ؟
س۱۰ ۔ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيْفًا ۔ شیطان کا فریب کمزور ہے اور عورتوں کے متعلق ہے إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ۔ (یوسف ۳) تمہارا فریب بڑا ہے ۔ حالانکہ شیطان فریبیوں کا استاد ہے ۔ اس کے مقابلہ میں عورتیں کیا حیثیت رکھتی ہیں ۔
ج ۔ شیطان کا مکر بمقابلہ نصرت الٰہی کے کمزور ہے اور عورتوں کا فریب بمقابلہ مردوں کے بڑا ہے ۔
س۱۱ ۔ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۔ کہہ دے کہ بھلائی اور برائی سب اللہ کی طرف سے ہے

پھر اس کے بعد ہے کہ جو بھلائی تجھے ملے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی ملے وہ خود تیری طرف سے ہے۔ اس لئے دونوں میں تعارض کا خیال ہوتا ہے۔

ج ۔ بُرائی ہماری طرف سے اس لئے ہے کہ اس کے اسباب ہماری طرف سے ہوتے ہیں۔ مگر وہ پہنچتی ہیں مشیت الٰہی کے ماتحت۔ اس لئے تعارض نہیں ہے۔

س ۱۱۔ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا ۔ قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے۔ اس سے کم اختلافات کی نفی نہیں ہوتی۔

ج ۔ کثیر کا لفظ مقابلۃً استعمال ہوا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ وہ قرآن میں غور نہیں کرتے کیا اس میں کوئی اختلاف ہے؟ اگر وہ اللہ پاک کی طرف سے نہ ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے نہ کہ تھوڑے۔

س ۱۳۔ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَاً ۔ کسی مومن کو حق نہیں کہ مار ڈالے کسی مومن کو مگر چوک سے۔ کیا چوک سے مار ڈالنے کا حق ہے۔

ج ۔ چوک بالارادہ نہیں ہوتی اس لئے اس سے کوئی حق پیدا نہیں ہوتا۔

س ۱۶۔ اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا مشرک اللہ کے سوا نہیں پکارتے ہیں مگر دیبیوں کو۔ اس کے آگے ہے کہ وہ نہیں پکارتے ہیں مگر شیطان کو۔ دونوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔

ج ۔ وہ پکارتے تھے لات۔ منات اور عزّیٰ کو جو دیبیاں تھیں باغواے شیطان۔ اس لئے دیبیوں کو پکارنا ہی شیطان کو پکارنا تھا۔

س ۱۸۔ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ جو کوئی برا عمل کرے گا اس کو بدلہ ملے گا۔ کیا بُرے عمل معاف نہیں ہوتے؟

ج ۔ یہ اس خیال کے جواب میں کہا گیا ہے جو یہود اور مسلمان رکھتے تھے کہ ہم کو بُرے اعمال کی سزا نہ ملے گی۔ یہاں زور "جو کوئی" پر ہے بُرے عمل پر نہیں ہے۔ اس وجہ سے

اس سے معافی کی نفی نہیں نکلتی۔

س۲۰۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ۔ اے مومنو ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر۔ کیا مومنوں سے ایمان کا مطالبہ تحصیل حاصل نہیں ہے؟

ج۔ اس مطالبہ سے مقصود ایمان پر ثابت قدمی ہے کیونکہ اس کے بعد ہے کہ اگر ایمان سے روگردانی کروگے تو سخت گمراہی میں جا پڑوگے۔

س۲۱۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ۔ منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے۔ منافقین کم سے کم زبان سے تو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں پھر ان کی سزا کافروں سے سخت کیوں ہے؟

ج۔ اس لئے کہ کفر میں دل سے وہ کفار کے ساتھ ہیں اور زبان سے اللہ۔ رسول اور مومنوں کو دھوکا بھی دیتے ہیں۔

س۲۲۔ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰہِ۔ ہم نے اللہ کے رسول مسیح عیسیٰ بن مریم کو قتل کر ڈالا۔ یہود حضرت عیسیٰ کی رسالت کے قائل نہیں ہیں پھر کیسے ان کو رسول اللہ کہا؟

ج۔ مذاق اڑانے کے لئے جیسے فرعون نے حضرت موسیٰ کی نسبت کہا اِنَّ رَسُوْلَکُمُ الَّذِیْ اُرْسِلَ اِلَیْکُمْ لَمَجْنُوْنٌ (شعراء۲) جو رسول تمہاری طرف بھیجا گیا ہے وہ پاگل ہے۔ (نعوذ باللہ)

س۲۳۔ وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ سارے اہل کتاب موت سے پہلے اس پر ایمان لائیں گے۔ یہاں بہٖ اور موتہٖ کی واحد غائب ضمیروں کے مرجع میں بہت اختلافات کئے گئے ہیں۔

ج۔ عربیت کے جملہ اصول نیز سیاق وسباق کے لحاظ سے ان دونوں ضمیروں کا مرجع سوائے حضرت عیسیٰ کے اور کوئی نہیں ہوسکتا اور اس آیت سے نصاً

نہیں مگر الترامًا یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے اور جملہ اہل کتاب ان پر ایمان لائیں گے۔ سورہ زخرف ع۶ میں ہے وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ اور عیسیٰ قیامت کی نشانی ہیں۔

س ۲۲ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۔ تاکہ رسولوں کے بعد انسانوں کو اللہ کے اوپر حجت باقی نہ رہ جائے۔ کس بات کی حجت؟

ج۔ عہد اَلَسْتُ کے بعد اللہ نے بنی آدم سے کہا تھا کہ دیکھو ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن آ کر کہنے لگو کہ ہم اس کو بھول گئے تھے۔ مگر وہ عہد دنیا میں آنے کے بعد ہم میں سے کس کو یاد ہے؟ اس لئے بھولنے کا عذر معقول ہوتا۔ لیکن اللہ نے دنیا میں رسولوں کا سلسلہ جاری کر دیا تاکہ اس عہد کو یاد دلاتے رہیں۔ لہٰذا اب انسانوں کو قیامت کے دن یہ کہنے کا حق نہیں رہا کہ ہم بھول گئے تھے۔

س۔ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ اللہ نے قرآن کو اتارا اپنے علم کے ساتھ۔ اللہ کے افعال اس کی قدرت سے ہوتے ہیں یہاں علم کو کیوں مخصوص فرمایا؟

ج۔ اس کی وضاحت سورہ ہود ع۲ سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مشرکوں سے کہو کہ قرآن جیسی دس سورتیں گھڑ کر بنائیں فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا اَنَّمَا اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ اگر وہ نہ بنا سکیں تو یقین کر لو کہ قرآن اللہ ہی کے علم کے ساتھ اُترا ہے۔ بندوں کے پاس وہ علم کہاں۔

س۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن علم ہی کے لحاظ سے معجزہ ہے۔

ج۔ یہ بحث اعجاز قرآن کی ہے اور ہم نکات قرآن لکھنے بیٹھے ہیں۔ مگر تاہم اتنا کہہ دینا بے موقع نہ ہوگا کہ اسی آیت سے عبارت کے اعجاز کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ کیونکہ ان سے کہا گیا تھا کہ وہ گھڑ کر ہی ایسی سورتیں بنائیں۔ اور جب نہ بنا سکے تو اس کی عبارت معجزہ ہے۔

س ۲۴ - اِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَلَهٗ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ وَهُوَ يَرِثُهَا اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۔ اگر کوئی مرد مر گیا جس کے کوئی اولاد نہیں ہے اور اس کی بہن ہے تو بہن کو نصف ملے گا متروکہ کا اور بھائی بہن کا وارث ہوگا۔ اگر بہن کے کوئی اولاد نہ ہو۔ مگر فقہ فرائض میں تو بیٹی کے ہوتے ہوئے بہن وارث قرار دی گئی ہے ۔

ج - ہاں اللہ نے تو ایک ہی آیت میں دو مرتبہ تصریح کی کہ بہن یا بھائی اسی وقت وارث ہوں گے جب میت کی کوئی اولاد نہ ہو مگر ہمارے فقہاء نے کہا کہ اولاد ہوگی تب بھی ہم ان کو ترکہ دیں گے ۔

سورۃ المائدہ

س۔ یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ اُحِلَّتْ لَکُمْ بَھِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ اے مومنو! اپنے اقرار پورے کرو۔ تمہارے لئے چرندے چوپائے حلال کئے گئے۔ دونوں جملوں میں ربط کی کیا ضرورت ہے؟

ج۔ ایمان لانا اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ اللہ نے جن چیزوں کو حلال کیا ہے ان کو حلال اور جن کو حرام کیا ہے ان کو حرام سمجھیں گے۔ اس کے بعد حلال اور حرام کی مفصل تشریح کی گئی ہے۔

س۔ حرام چوپایوں میں مَآ اَکَلَ السَّبُعُ کو بھی شمار کیا ہے حالانکہ درندہ جس کو کھا گیا اس کی حلت و حرمت کا سوال ہی باقی نہیں رہا۔

ج۔ اس کے معنی ہیں درندہ کے کھانے سے جو مر چکا اس سے جو بچ گیا ہے وہ حرام ہے۔

س۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تمہارے اوپر پوری کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا۔ کیا آج سے پہلے دین اسلام پسند نہیں تھا؟

ج۔ اَلْیَوْمَ یعنی آج پہلے دونوں جملوں کے ساتھ ہے۔ تیسرا جملہ مطلق ہے اسلام سے اللہ کی رضا ہمیشہ سے ہے جس کا ثبوت قرآن کی متعدد آیات سے ملتا ہے۔

س۔ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ تمہارے لئے پاک چیزیں حلال کی گئی ہیں اور جو شکاری جانور تم نے سدھلئے۔ کیا شکاری جانور

بھی حلال کر دیئے گئے ہیں۔

ج۔ شکاری جانوروں کا شکار حلال کیا گیا ہے جس کی تصریح آگے ہے فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ ان کو کھاؤ جن کو یہ تمہارے لئے پکڑ لیں۔

س۱۔ وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ جو ایمان سے کفر کرے گا اس کے عمل اکارت جائیں گے۔ کفر بالایمان کا مقابل ہوگا ایمان بالایمان اور اس کے تو کچھ معنی نہیں۔

ج۔ کفر کے اصل معنی ہیں انکار۔ ایمان سے انکار ارتداد ہے جو مرتد ہو گیا اس کے عمل اکارت گئے۔

س۲۔ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا وہ تم سے ظاہر کر دیتا ہے بہت سی باتیں توریت کی جن کو تم چھپاتے ہو اور بہت سی باتوں سے چشم پوشی کرتا ہے۔ رسول کے لئے کتمان حق کیسے جائز رکھا گیا۔

ج۔ کتمان حق نہیں بلکہ عدم اظہار باطل۔ دین کے لئے جن امور کا اظہار ضروری تھا کیا جاتا تھا۔ اور جن سے محض یہود کی ہتک حرمت ہوتی تھی اُن سے چشم پوشی کی جاتی تھی۔

س۳۔ كِتَابٌ مُبِينٌ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ۔ واضح کتاب جس کے ذریعہ سے اللہ اس کو ہدایت کرتا ہے جو اس کی رضا کا تابع ہو رضا کا تابع ہونا ہدایت پر موقوف ہے اور ہدایت رضا کے تابع ہونے پر یہ تو دور لازم آتا ہے۔

ج۔ یہاں اضمار ہے۔ یعنی اللہ اس کو ہدایت کرتا ہے جو اس کی رضا کے تابع ہونے کا ارادہ کرے۔

س۵۔ فَأَصْبَحَ مِنَ النَّادِمِينَ قابیل ہابیل کو قتل کر کے نادم ہوا۔ ندامت توبہ

ہے۔ پھر اس کا شمار خاسرین میں کیوں ہوا۔
ج۔ حقوق العباد میں توبہ سے کام نہیں چلتا۔ پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ قتل پر نادم ہوا تھا یا اس بات پر کہ اس کو ٹھکانے سے نہیں لگا سکا تھا۔
س۔ یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ
اے ایمان والو اللہ سے ڈرتے رہو اور ڈھونڈو اس تک وسیلہ اور جہاد کرو اس کی راہ میں۔ یہاں وسیلہ کے کیا معنی ہیں؟ بہت سے لوگ اللہ تک رسائی حاصل کرنے کے لئے مشائخ کو اپنا وسیلہ بناتے ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے؟
ج۔ اللہ اپنے بندوں سے اُن کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اس لئے بندے اور اس کے معبود کے درمیان کسی انسانی وسیلہ کی گنجائش ہی نہیں۔ وسیلہ کے معنی ہیں قرب کے اور یہ تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ سے حاصل ہوتا ہے۔ یہاں تلاش وسیلہ کی تفسیر ہے جہاد فی سبیل اللہ۔ سورہ بنی اسرائیل ع۶ میں بھی وسیلہ کا لفظ آیا ہے اور وہاں بھی اس کے یہی معنی ہیں قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا یَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِیْلًا ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ ۔ تو کہہ دے کہ اللہ کے سوا جن کو تم مانتے ہو پکارو وہ نہ تمہاری مصیبت دفع کر سکیں گے نہ ٹال سکیں گے۔ خود وہ دعا کرتے ہیں اور اپنے رب کی طرف قربت ڈھونڈ رہے ہیں وہ بھی جو ان میں سے سب سے زیادہ قریب ہے اور اُمید رکھتے ہیں اللہ کی رحمت کی اور ڈرتے ہیں اس کے عذاب سے کسی انسان سے خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو۔ صرف علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ہدایت کے لئے قرآن ہی ہے۔ اس کے ذریعہ سے قرب کی راہیں نکلتی ہیں۔
س۔ اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا چور مرد اور چور عورت دونوں کے

ہاتھ کاٹ لو۔ یہاں سرقہ کی حد میں مذکر پہلے ہے اور مؤنث اس کے بعد۔ مگر سورۂ نور کے پہلے رکوع میں زنا کی حد میں پہلے مونث ہے اور مذکر اس کے بعد اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا۔

ج۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ سرقہ کا اقدام زیادہ تر مرد کرتے ہیں۔

س۹۔ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَۃً اس سے بُرا نتیجہ۔ ثواب کا لفظ نیک انجام کے لئے ہے اور یہاں بُرے کے لئے استعمال ہوا ہے۔

ج۔ ثواب کا مفہوم مطلق جزا ہے بُری ہو یا اچھی۔ اسی سورہ ۱۱ میں ہے فَاَثَابَھُمُ اللّٰہُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ۔ اللہ نے ان کے اس قول کے عوض میں ان کو جنتیں دیں۔ اور آل عمران ۱۱ میں ہے فَاَثَابَکُمْ غَمًّا بِغَمٍّ بدلہ دیا تم کو غم پر غم۔

س۱۰۔ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ اگر تُو نے تبلیغ نہ کی تو اس کا پیغام نہیں پہنچایا۔ یہاں شرط اور جزا کا ایک ہی مفہوم ہے۔

ج۔ پیغمبر کا سب سے بڑا فریضہ ہے تبلیغ۔ یہاں مطلب یہ ہوا کہ اگر تبلیغ نہ کی تو اپنے فریضہ کو ادا نہ کیا۔

س۔ وَاللّٰہُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اللہ تجھ کو انسانوں سے محفوظ رکھے گا پھر اُحد میں کیوں رسول اللہ کے چہرہ پر زخم آیا اور دندان مبارک شہید ہوئے؟

ج۔ یہ آیت جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی ہے۔

س۱۱۔ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا کَثِیْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ۔ جو پہلے گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور سیدھے راستہ سے گمراہ ہوئے ایک ہی جملہ میں دو مرتبہ گمراہ ہوئے کس مقصد کے لئے کہا گیا۔

ج۔ آیت میں نصاریٰ کا ذکر ہے۔ پہلی گمراہی ان کی یہ تھی کہ انجیل کو چھوڑا اور دوسری

یہ کہ قرآن جب اترا تو اس پر ایمان نہ لائے۔

س[۱۵]۔ يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ جس دن اللہ رسولوں کو جمع کرے گا اُن سے پوچھے گا کہ تم کو کیا جواب ملا وہ کہیں گے ہم کو کچھ علم نہیں تو ہی غیب کی باتوں کو جانتا ہے اور سورہ ہود [۱۲] میں ہے وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ گواہی دینے والے (رسول) کہیں گے یہ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا۔ ایک جگہ تو رسول لاعلمی ظاہر کرتے ہیں اور دوسری جگہ اپنی قوم کے خلاف گواہی دیتے ہیں ان میں باہم تعارض کا خیال ہوتا ہے۔

ج۔ گواہی دینے والے یعنی انبیاء گواہی دیں گے ان باتوں کی جو ان کی زندگی میں ہوئیں اور لاعلمی ظاہر کریں گے ان اعمال سے جو ان کے بعد ان کی قوموں نے کئے۔ یہ نکتہ پہلی آیت میں عَلَّامُ الْغُيُوْبِ کے لفظ سے حل ہوتا ہے۔ یعنی ہماری عدم موجودگی میں جو کچھ ہوا اس کو تو ہی خوب جانتا ہے کیونکہ علام الغیوب ہے ہم بے خبر ہیں۔

س[۱۵]۔ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ۔ کیا تیرا رب آسمان سے ہمارے لئے خوان اتار سکتا ہے؟ کیا یہ قدرت الٰہی میں شک نہیں ہے؟

ج۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی محتاج کسی غنی سے کہے کہ آپ مجھے کچھ دے سکتے ہیں؟ بے شک اس میں بے ادبی کا ایک پہلو ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عیسیٰ نے ان کو تنبیہ کی اور کہا اللہ سے ڈرو مگر اللہ نے ان نومسلموں کے قصور پر پردہ ڈال دیا ہے۔

س[۱۶]۔ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ جب سے تو نے مجھے وفات

دے دی اس وقت سے تو خود ان کا نگران ہے۔ حضرت عیسٰی نے یہاں اپنے لئے وفات کا لفظ استعمال کیا۔ حالانکہ وہ تو زندہ اٹھا لئے گئے تھے۔

ج۔ تَوَفَّيْتَنِيْ کے معنی ہیں میرے دنیا میں رہنے کے دن پورے کر دیئے جان نکالنے کے معنی نہیں ہیں۔ علاوہ بریں یہ سوال وجواب قیامت کے دن ہوگا پھر اس میں اشکال کیا رہا۔

س۔ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِيْنَ صِدْقُهُمْ یہ دن ہے کہ سچوں کو ان کی سچائی نفع دے گی۔ اگر مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن وہ سچائی نفع دے گی جو دنیا میں ہوئی تو جواب موقع کے مطابق نہیں۔ کیوں کہ اس میں حضرت عیسٰیؑ کی اس سچی شہادت کا نفع بیان کیا گیا ہے جو وہ قیامت کے دن دیں گے۔ اور اگر مراد وہ سچائی ہے جو قیامت کے دن ہوگی تو وہ دار عمل نہیں ہے بلکہ دار مکافات ہے۔

ج۔ صدق سے مراد ہے مطلق صدق بلا قید زمان ومکان دنیا اور آخرت دونوں میں۔

سُوْرَۃ اَنْعَام

سؔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ۔ اللہ نے آسمانوں کو پیدا کیا اور زمین کو اور تاریکیوں کو بنایا اور نور کو۔ کیا خلق اور جعل میں معنے کے لحاظ سے فرق ہے؟ پھر ظلمات کا لفظ جمع ہے اور نور کا مفرد۔

ج۔ فرق ہے مگر یہاں دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ توسیع عبارت کے لئے دو مختلف الفاظ لائے گئے ہیں اور عطف میں جمع اور مفرد کا استعمال عام ہے پہلے ہی فقرہ میں ہے۔ سمٰوات اور ارض جمع اور مفرد۔

سؔ قُلِ اللّٰہُ شَھِیْدٌ بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ۔ کہہ دے کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے۔ کسی دعویٰ کرنے والے کے لئے یہ شہادت کیونکر کافی ہو سکتی ہے؟

ج۔ بے شک کسی مدعی کے لئے صرف اللہ کو شہادت میں پیش کرنا کافی نہیں ہے لیکن یہاں اس شہادت کے بعد قرآن پیش کیا گیا ہے جس کے مقابلہ سے دنیا عاجز ہے۔

سؔ۔ وَاللّٰہِ رَبِّنَا مَا کُنَّا مُشْرِکِیْنَ۔ مشرک قیامت میں کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار اللہ کی قسم ہم مشرک نہ تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ شرک چھپائیں گے حالاں کہ سورہ نساء ع۶ میں ہے وَلَا یَکْتُمُوْنَ اللّٰہَ حَدِیْثًا وہ اللہ سے کوئی بات چھپائیں گے نہیں۔

ج۔ مشرک جھوٹی قسم کھا کر اپنے شرک کو چھپانے کی کوشش کریں گے لیکن وہ چھپا نہ سکیں گے کیونکہ ان کے منہ پر مُہر لگا دی جائے گی اور ان کے ہاتھ اور پاؤں گواہی دینے لگیں گے جیسا کہ فرمایا اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاھِھِمْ وَتُکَلِّمُنَآ اَیْدِیْھِمْ

وَتَشۡهَدُ اَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ (یٰسٓ) اس لئے نہیں چھپائیں گے معنی ہوئے نہیں چھپا سکیں گے۔

س ۔ وَاِنۡ كَانَ كَبُرَ عَلَيۡكَ اِعۡرَاضُهُمۡ فَاِنِ اسۡتَطَعۡتَ اَنۡ تَبۡتَغِىَ نَفَقًا فِى الۡاَرۡضِ اَوۡ سُلَّمًا فِى السَّمَآءِ فَتَاۡتِيَهُمۡ بِاٰيَةٍ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمۡ عَلَى الۡهُدٰى فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ ۰ اگر تیرے اُوپر مشرکوں کی روگردانی گراں گذرتی ہے تو اگر تجھ سے ہو سکے تو زمین میں کوئی سوراخ تلاش کر یا آسمان پر سیڑھی لگا اور ان کے لئے نشانی لا۔ اللہ اگر چاہتا تو سب کو سیدھے راستے لگا دیتا۔ تو جاہلوں میں سے نہ بن۔

اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کو کوئی معجزہ نہیں دیا گیا بلکہ اس کی خواہش پر عتاب فرمایا گیا۔

ج ۔ خاتم النبیین کو عقلی معجزہ قرآن دیا گیا جو ہمیشہ کے لئے قائم ہے۔ مشرکین چاہتے تھے کوئی حسی معجزہ جو آنکھوں سے دیکھا جا سکے فَلۡيَاۡتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَاۤ اُرۡسِلَ الۡاَوَّلُوۡنَ (انبیاء) چاہیئے کہ لائے وہ ہمارے لئے ایسی نشانی جیسی پہلے رسولوں کو ملی سورہ قصص ع۵ میں ہے لَوۡلَاۤ اُوۡتِىَ مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِىَ مُوۡسٰى کیوں نہ اس کو نشانی دی گئی جیسی موسیٰ کو دی گئی تھی۔ آنحضرتؐ کی خواہش تھی کہ کوئی نشانی جیسی کہ یہ منکرین طلب کرتے ہیں مل جائے تو میں ان کو قائل کر کے مسلمان بنا لینا۔ اس پر عتاب اترا ہے[1]۔

س ۔ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ ۰ تو ہرگز جاہلوں میں سے نہ بن۔ آنحضرتؐ کے

---

[1] معجزہ کی بحث ہم نے اپنی کتاب "تعلیمات قرآن" میں کسی قدر مفصل لکھ دی ہے۔

ساتھ خطاب بہت سخت ہے اور حضرت نوحؑ کے ساتھ اِنِّیٓ اَعِظُکَ اَنۡ تَکُوۡنَ مِنَ الۡجٰھِلِیۡنَ ٥ (ھود) میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ جاہلوں میں سے نہ بن. بمقابلہ اس کے نرم ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

ج۔ حضرت نوح بالکل ناواقف تھے کہ میرا بیٹا میرے اہل میں سے نہیں ہے اسی بناء پر انہوں نے اللہ کے سامنے اس کے وعدہ کو پیش کیا۔ لہٰذا وہ معذور تھے اور خاتم النبیین پر کفار کی روگردانی معجزہ نہ ملنے کی وجہ سے جو گراں گذرتی تھی اس میں وہ معذور نہ تھے۔ کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ بلا مشیت الٰہی کے ان کا ایمان لانا ناممکن ہے خواہ ہزاروں معجزے دکھائے جائیں۔

س۔ وَقَالُوۡا لَوۡلَا نُزِّلَ عَلَيۡهِ اٰيَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ قُلۡ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنۡ يُّنَزِّلَ اٰيَةً اور مشرکوں نے کہا کہ اس نبی پر معجزہ کیوں نہ اتارا گیا۔ کہہ دے اللہ معجزہ اتارنے پر قادر ہے یہ تو ایسی بات ہے کہ ہر مدعی نبوت کہہ سکتا ہے۔

ج۔ لیکن جب تک وہ اپنی نبوت کا ثبوت نہ دے اس کی بات صحیح نہ ہو گی۔ اور آنحضرت تو اپنی نبوت کا ثبوت قرآن کا معجزہ پیش کر کے دے چکے تھے۔ منکرین ایسا معجزہ چاہتے تھے جو بصیرت سے نہیں بلکہ بصارت سے دیکھا جائے جیسے حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کے معجزات تھے۔ اس کی بابت کہا گیا کہ اللہ ایسا معجزہ اتارنے پر بھی قادر ہے۔

س۔ وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا طٰۤئِرٍ يَّطِيۡرُ بِجَنَاحَيۡهِ۔ نہیں ہے کوئی چلنے والا زمین پر اور نہ کوئی پرندہ جو اپنے دو بازوؤں سے اڑتا ہے دَآبَّةٍ زمین پر چلنے والے ہی کو کہتے ہیں پھر فِى الۡاَرۡضِ کس مصلحت سے لایا گیا۔ اسی طرح ہر پرندہ اپنے دونوں بازو ہی سے اڑتا ہے۔ اس کے اظہار میں کیا فائدہ ہے۔

ج۔ کلام میں ان متعلقات کا اظہار تاکید کے لئے ہوا کرتا ہے۔ خود قرآن میں اس کی

مثالیں ہیں الٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۔ يَقُولُونَ بِأَلْسِنَتِهِمْ ۔

سؑ ۔ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۔ کہہ دے کہ میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ غیب جانتا ہوں اور نہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں ۔ پہلے اور تیسرے جملہ میں لَآ اَقُوْلُ ہے اور بیچ کے جملہ میں نہیں ہے ۔ اس میں کیا رمز ہے؟

ج ۔ اس زمانہ میں کاہن اور نجومی وغیرہ بزعم خود غیب کی خبریں بیان کرتے تھے اور لوگ عام طور پر ان کو مانتے تھے ۔ اس لئے رسول کی ذات سے اس کی مطلق نفی کی گئی ۔ بخلاف اس کے کسی بشر کے خزائن الٰہی کے مالک یا فرشتہ ہونے کا خیال عام نہیں تھا اس کی نفی کے لئے لَآ اَقُوْلُ کا لفظ کافی تھا ۔

سؑ ۔ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وہ پلٹائے جائیں گے اللہ کی طرف جو اُن کا حقیقی مولا ہے ۔ سورہ محمد ع۱ میں ہے وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ کافروں کا کوئی مولا نہیں ہے ۔ کیا تعارض نہیں ہے ؟

ج ۔ مولا کے بہت سے معانی ہیں پہلی آیت میں اس سے معبود مراد ہے اور دوسری میں مددگار ۔ اس لئے تعارض نہیں ہے ۔

سؑ ۔ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ اسی کا ملک ہوگا جس دن صور پھونکا جائے گا ۔ ملک تو ہمیشہ سے اسی کا ہے ۔ قیامت کے دن کی کیا خصوصیت ہے ۔

ج ۔ یہ بات قرآن میں کئی جگہ بیان کی گئی ہے ۔ سورہ مومن ع۲ میں ہے لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۔ آج کس کی حکومت ہے ؟ قابو رکھنے والے اکیلے اللہ کی ۔ سورۂ انفطار میں ہے يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَّالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۔ اس دن کوئی کسی کا بھلا نہ کر سکے گا اور اس دن اللہ ہی کا حکم ہوگا اس آیت سے قیامت کے دن کی خصوصیت واضح ہو جاتی ہے کیونکہ دنیا میں

کچھ نہ کچھ بھلائی ایک دوسرے کے ساتھ کرسکتا ہے اور کہنے کو حکومت اور ملکیت بھی لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اس دن سب کچھ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔

س۔ وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ ہم نے ابراہیم کو بخشا اسحاق اور یعقوب یہاں اللہ کے احسان کا ذکر ہے پھر اسمٰعیل کا نام کیوں نہ لیا گیا وہ تو بڑے بیٹے تھے۔

ج۔ حضرت اسحٰق اور اُن کے بیٹے یعقوب کی بشارت فرشتے اس وقت لائے تھے جب حضرت ابراہیم بہت کہن سال اور ان کی بیوی حضرت سارہ بہت بڈھی ہو چکی تھیں۔ اس لئے وہ نعمت غیر مترقبہ تھے اور حضرت اسمٰعیل بہت پہلے پیدا ہو چکے تھے اور اس بیوی سے نہ تھے جس سے وہ اولاد کے خواہش مند تھے۔

س۔ حضرت اسحٰق ابراہیم کے بیٹے تھے لیکن یعقوب تو پوتے تھے ان کا ذکر اس موقع پر کس وجہ سے کیا گیا۔

ج۔ صرف اس موقع پر نہیں بلکہ فرشتے جب ان کے پاس آئے تھے اس وقت بھی اللہ کی طرف سے ان کی بیوی سارہ کو دونوں کی ساتھ ساتھ بشارت دی گئی تھی فَبَشَّرْنٰهَا بِإِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَاءِ إِسْحٰقَ يَعْقُوبَ ۞ ہم نے اس کو خوشخبری دی اسحٰق کی اور اسحٰق کے بعد یعقوب کی۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کا کہ ذبیح اسحاق نہیں ہوسکتے کیونکہ اُن سے یعقوب کے پیدا ہونے کا وعدہ کیا گیا ہے۔

س۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ایسا ہی ہم نے بنائے ہر نبی کے دشمن انس اور جن شیاطین۔ جو سکھاتے ہیں ایک دوسرے کو ملمع کی ہوئی دھوکا دینے والی باتیں۔ شیاطین تو ہر نیکی کے دشمن ہیں انبیاء کی کیا خصوصیت ہے۔

ج۔ اس سورہ کی پہلی آیت میں ہے کہ اللہ نے ظلمت اور نور کو بنایا۔ نبی سراجاً منیرا اور ہدایت کا مینارہ ہوتا ہے اس وجہ سے شیاطین یعنی کذابین اپنی پوری طاقت

لگاتے ہیں کہ اس روشنی کو بجھا دیں ایک قسم ان شیاطین کی وہ ہے جو نبی کے اوپر اتری ہوئی آیتوں میں اپنی طرف سے الفاظ ڈالتی ہے جن سے ان کے معانی بدل جائیں جیساکہ سورہ حج میں ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۔ تجھ سے پہلے ہم نے جو رسول یا نبی بھیجا اس نے جب تلاوت کی شیطان نے اس کی تلاوت میں ملاوٹ کردی اللہ کی ملاوٹ کو مٹاکر اپنی آیتوں کو پختہ کردیتا ہے۔

یعنی آیات الٰہی میں یہ شیاطین اضافے یا الحاق یا تغیر وتبدیل وغیرہ کرتے ہیں۔ اللہ نے اس کی ذمہ داری لی کہ ہم ان کی ملاوٹ نکال کر اپنی آیتوں کو پکی کردیں گے[1]۔ دوسری قسم کے شیاطین کا ذکر یہاں ہے کہ وہ نبی کے متعلق یا اس کے نام سے طرح طرح کی جھوٹی روایتیں گھڑ کر لوگوں میں پھیلاتے ہیں کہ دین الٰہی پر پردہ ڈال دیں۔ ان کی بابت حکم دیا فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ان کو چھوڑ و اور ان کی گھڑی ہوئی باتوں کو بھی۔

س ۔ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا۔ وہی ہے جس نے تمہاری طرف مفصل کتاب اتاری ہے۔ یہ کتاب رسول کی طرف اتاری گئی ہے اور یہاں ضمیر جمع مخاطب کی لائی گئی ہے۔ پھر مفصل کا مطلب کیا ہے؟

ج ۔ قرآن نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا گیا ہے۔ سارے انسانوں کے لئے اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ہم نے انسانوں کی ہدایت کے لئے تیرے اوپر کتاب نازل کی ہے حق کے ساتھ۔ اسی وجہ سے قرآن میں جابجا تنزیل کی نسبت

---

[1] ۔ اس کی تفصیل سورہ حج میں اپنے موقع پر آئے گی۔

جمع مخاطب کی طرف کی گئی ہے اور مفصل کا مطلب یہ ہے کہ قرآنی آیات کی تفصیل قرآن ہی میں کردی گئی ہے۔ سورہ ہود کی پہلی آیت ہے کِتَابٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ۔ عظیم الشان کتاب جس کی آیات بنائی گئیں۔ پھر ان کی تفصیل حکمت اور خبر رکھنے والے اللہ کی طرف سے کی گئی۔ اس لئے قرآن اپنی تفصیل میں کسی دوسرے کا محتاج نہیں۔

۱۶
س۔ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ انہوں نے اپنی اولاد کو قتل کیا نادانی سے بے سمجھے نادانی میں بے سمجھی بھی داخل ہے۔ پھر اس کا اظہار کس غرض سے ہے۔

ج۔ مزید قباحت کے اظہار کے لئے۔ چنانچہ اسی آیت میں اس کا نتیجہ بھی دو ہم معنی فقروں میں ہے قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ۔ وہ گمراہ ہوئے اور انہوں نے سیدھا راستہ نہ پایا۔

۱۷
س۔ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ۔ کہہ دے کہ جو وحی مجھ پر نازل ہوتی ہے اس میں کسی کھانے والے پر جو کھائے میں کوئی چیز حرام نہیں پاتا ہوں بجز اس کے کہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون یا سور کا گوشت یا گناہ کی چیز جس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے ربا، مال یتیم وغیرہ کئی چیزوں کا کھانا حرام کیا ہے۔

ج۔ یہاں جانوروں کی حلت اور حرمت کا ذکر ہے نہ کہ مطلق مال کا۔ یہ سورۂ انعام ہے جس میں چوپایوں کا ذکر سلسلہ وار چلا آرہا ہے۔ یہی چاروں محرمات سورہ مائدہ کے پہلے رکوع میں تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

۱۸
س۔ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ۔ تمہارے پاس کوئی علم ہو تو اس کو ہمارے سامنے نکالو۔ تم تو بس

گمان کے پیچھے چلتے ہو اور صرف اندازہ لگاتے ہو۔ کیا ظن سے علم حاصل نہیں ہوتا؟

ج۔ ظن کی تشریح تو اس آیت میں کر دی گئی ہے کہ جس چیز کا اندازہ لگایا گیا کہ غالباً صحیح ہو گی وہ ظن ہے اس کے مقابل میں علم کا لفظ لایا گیا ہے جس سے ظاہر ہو گیا کہ وہ ظن سے مختلف ہے اور اس کا اطلاق اس چیز پر ہو گا جس کا یقین ہو۔ چنانچہ دوسری جگہ ظن کا لفظ یقین کے مقابل میں لایا گیا ہے اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ۔ ہم صرف گمان رکھتے ہیں اور ہم کو یقین نہیں حاصل ہے۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ علم اور یقین دونوں کی حقیقت ایک ہے اسی کا نام علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین ہے سورہ تکاثر میں ہے لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۔ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ کاش تم کو یقینی علم ہوتا کہ تم ضرور دوزخ کو دیکھو گے پھر تم اس کو ضرور دیکھو گے یقین کی آنکھ سے۔ سورہ حاقہ کے آخر میں قرآن کے متعلق فرمایا وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ وہ حق الیقین ہے بے شک کہیں کہیں قرآن میں ظن کا لفظ یقین کے لئے بولا گیا ہے مثلاً اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ (بقرہ ع۵) جو یقین رکھتے ہیں کہ ان کو اپنے رب سے ملنا ہے۔ لیکن یہ ظن کا حقیقی معنی نہیں ہے[1] کیونکہ قرآن میں جا بجا ظن کی پیروی ممنوع قرار دی گئی ہے اور دین میں جس میں یقین کی ضرورت ہے وہ کار آمد نہیں۔ سورہ یونس ع۴ میں ہے وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ۭ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ۔ ان میں سے اکثر پیروی کرتے ہیں ظن کی اور ظن حق کی جگہ کچھ کام

---

[1] ظَنَنْتُ، زَعَمْتُ اور حَسِبْتُ کی طرح افعال یقین و شک میں سے ہے مگر علم یا یقین کے مقابلہ میں جب یہ بولا جاتا ہے تو اس کے معنی صرف گمان کرنے کے ہوتے ہیں اور اندازہ لگانے کے جیسا کہ آیات قرآنی سے واضح کیا گیا ہے۔

نہیں دیتا۔ یہی بات سورہ والنجم میں بھی کہی گئی ہے وَمَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ان کو کوئی یقین نہیں ہے صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں اور ظن حق کی جگہ کچھ کام نہیں دیتا۔ پھر ظن کو قرآن نے گمراہی کا ذریعہ قرار دیا ہے وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ (انعام ۱۴) روئے زمین کے اکثر لوگ ایسے ہیں کہ تو اگر ان کی اطاعت کرے گا تو وہ تجھ کو اللہ کی راہ سے گمراہ کر دیں گے وہ صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں اور محض اندازے لگاتے ہیں۔

س ۱۹۔ قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ۔ کہہ دے کہ آؤ میں سُنا دوں جو کچھ تمہارے پروردگار نے تمہارے اوپر حرام کیا ہے۔ اس کے بعد دس احکام ہیں جن میں پانچ حرام ہیں اور پانچ واجب۔

ج۔ آیت میں حرّم کا لفظ جو آیا ہے۔ اس کے معنی مقرر کرنے کے ہیں جیسا کہ سورہ انبیاء میں ہے وَحَرَامٌ عَلَىٰ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ اور مقرر ہے اس بستی پر جس کو ہم نے ہلاک کر دیا کہ وہ واپس نہیں لوٹیں گے۔

س ۱۹۔ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا ۔ اور جب بات کہو تو انصاف کی۔ عدل کو قول کے ساتھ کیا خصوصیت ہے۔ یہ تو عملی چیز ہے۔

ج۔ عمل میں بھی قرآن نے جابجا عدل کا حکم دیا ہے یہاں قول کا لفظ اس لئے آیا کہ معاملہ شہادت کا ہے۔ کیا شہادت عمل نہیں ہے۔

سورۂ اعراف

س۱۔ لَا یَکُنْ فِیْ صَدْرِکَ حَرَجٌ مِّنْهُ تیرے دل میں اس کی طرف سے تنگی نہ ہو
نہی کی نسبت مخاطب کی طرف نہیں بلکہ تنگی کی طرف کی گئی ہے۔
ج۔ ایسا جملہ بلیغ ہوتا ہے۔ مثلاً میں یہاں تجھ کو نہ دیکھوں۔ یعنی میرے سامنے سے ہٹ جا۔ آیت کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کی رو سے تبلیغ کرنے میں تو اپنے دل میں تنگی نہ رکھ۔ حضرت نوح نے فرمایا لَا یَکُنْ اَمْرُکُمْ عَلَیْکُمْ غُمَّةً (یونس ع۸) تمہارا معاملہ تمہارے اوپر ڈھکا نہ رہے۔
س۱۔ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ اسی کی پیروی کرو جو اترا ہے تمہاری طرف۔ تمہارے رب کے یہاں سے اور اس کے سوا دوسرے آقاؤں کی پیروی نہ کرو۔ یہاں امر کے بعد نہی کی کیا خاص ضرورت تھی؟
ج۔ عام طور پر لوگ شخصیت پرستی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور کتاب اللہ کی پیروی کے ساتھ غیروں کی بھی پیروی کرنے لگتے ہیں وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِکُوْنَ ۰ (یوسف ع۱۲) ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان لا کر بھی مشرک رہتے ہیں۔ سورہ شوریٰ ع۳ میں ہے اَمْ لَهُمْ شُرَکٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا لَمْ یَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ کیا ان کے اور شریک ہیں جنہوں نے ان کے لئے دین کی وہ شریعت بنائی ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی ہے اس لئے کتاب اللہ کی پیروی کے امر کے ساتھ غیر اللہ کی پیروی سے نہی کی ضرورت تھی۔ قرآن میں جابجا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تاکید کی گئی کہ قرآن ہی کی پیروی کرو اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ (انعام ع۱۳) اس کی پیروی کر جو تیرے رب کی طرف تجھے وحی

کی گئی ہے۔اس سورہ کے رکوع ع۱۲ میں آنحضرت کی زبان سے اعلان کرایا گیا
قُلْ اِنَّمَا اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ کہہ دے کہ میں تو بس اسی کی پیروی کرتا
ہوں جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر وحی آتی ہے اور وہ وحی یہ قرآن ہے وَاُوْحِیَ
اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ (انعام ع۲) اور میرے اوپر یہ قرآن اترا
ہے کہ اس کے ذریعہ سے تم کو آگاہ کروں قُلْ اِنَّمَا اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ (الانبیاء ع۴)
کہہ دے کہ میں تم کو صرف وحی کے ذریعہ سے آگاہ کرتا ہوں اور یہی اللہ نے ہدایت
فرمائی ہے فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (ق ع۳) آگاہ کر قرآن کے ذریعہ
سے اس کو جو میرے حساب سے ڈرتا ہے۔

س۱۔ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا ہم نے اس بستی کو ہلاک کیا پھر اس پر ہمارا عذاب
آیا۔ ہلاکت کے بعد عذاب آیا یا عذاب کے بعد ہلاکت آئی۔

ج۔ ہلاک کرنے کا مفہوم یہاں ہے اس کا ارادہ جیسے اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا
وُجُوْهَكُمْ (مائدہ ع۲) جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو وضو کرو۔ یعنی نماز میں کھڑے
ہونے کا ارادہ کرو۔

س۲۔ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ
اِبْلِيْسَ۔ ہم نے تم کو پیدا کیا پھر تمہاری صورت گری کی پھر فرشتوں سے
کہا آدم کو سجدہ کرو۔ انہوں نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے۔ یہاں جمع مخاطب کی ضمیر
سے ہم سب سے خطاب ہے حالانکہ ملائکہ کو سجدۂ آدم کا حکم ہماری تخلیق سے
پہلے دیا گیا تھا اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ
وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ (ص ع۵) جب
کہا تیرے رب نے فرشتوں سے میں بنانے والا ہوں ایک بشر مٹی سے۔ جب
اس کو ٹھیک کر لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تم اس کے لئے سجدہ

میں گر جانا۔

ج۔ حضرت آدم اور ہم میں بشریت ایک ہی ہے۔ اس جمع مخاطب کی ضمیر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ملائکہ اور ابلیس یعنی خیر و شر کا تعلق مطلق بشریت کے ساتھ ہے۔ یہ اکیلے حضرت آدم کا قصہ نہیں ہے۔

س ۱۲۔ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ فرشتوں نے سجدہ کر دیا بجز ابلیس کے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس بھی ملائکہ میں سے تھا۔ اس لئے کہ اگر ان میں سے نہ ہوتا تو مستثنیٰ کیوں کیا تھا۔

ج۔ حکم ابلیس کو بھی دیا گیا تھا۔ اسی آیت سے آگے ہے قَالَ يَآاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ لَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ اللہ نے فرمایا اے ابلیس کیا مانع ہوا جب میں نے حکم دیا تو نے سجدہ نہ کیا۔ لہٰذا اس استثناء سے صرف یہ ثابت ہوا کہ جن کو سجدہ کا حکم دیا گیا تھا ان میں سے ابلیس نے سجدہ نہیں کیا۔ قرآن میں تصریح ہے کہ ابلیس جن ہے كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (کہف ۷) ابلیس جن ہے اور وہ اپنے رب کے حکم سے سرتابی کر بیٹھا ہے۔ علاوہ بریں ابلیس کی ذریت ہے اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ (الکہف ۷) کیا تم ابلیس اور اس کی ذریت کو میرے سوا اپنا مولا بناؤ گے؟ پھر ابلیس کے قبیلہ ہے اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (اعراف ۳) ابلیس اور اس کا قبیلہ تم کو دیکھتا ہے جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھتے۔ کیا فرشتے ذریت اور قبیلہ رکھتے ہیں ؟

س۔ ابلیس کو قیامت تک کی مہلت کیوں دی گئی جبکہ اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں تیرے بندوں کو گمراہ کروں گا۔

ج۔ دنیا انسانوں کی آزمائش کے لئے ہے خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ (الملک ۱) اللہ نے موت اور حیات تمہاری آزمائش کے لئے پیدا کی ہے۔ اس لئے یہاں زخارف

دنیا اور لذاتِ نفس کے علاوہ ایک بہکانے والے ابلیس کا وجود بھی ضروری تھا
اللہ نے روز روز نیا ابلیس پیدا کرنے کے بجائے ایک ہی ابلیس کو قیامت تک
کی زندگی دے دی۔

س۲۔ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَاوُرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا
پھر آدم اور حوّا کو شیطان سے بہکایا تاکہ اُن کے اُوپر ان کے ڈھکے ہوئے ستر کو کھول
دے۔ شیطان کی غرض فریب دینے سے ان کے ڈھکے ہوئے ستر کو کھولنا نہ تھا
بلکہ ان کو جنت سے نکلوانا تھا۔

ج۔ لِيُبْدِيَ پر لامِ غایت کا نہیں بلکہ عاقبت کا ہے نتیجہ یہ ہوا جیسے فرعون
کے قصّے میں ہے فَالْتَقَطَهٗ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا (قصص ۱)
موسیٰ کو فرعون کے گھر والوں نے اٹھا لیا تاکہ وہ اُن کا دشمن اور ان کے لئے دکھ بنے۔

س۳۔ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا ابلیس نے اُتروائے ان کے لباس۔ یہ کون سا
لباس تھا جس کے اُترنے سے پہلے ان کو اپنے ستر کا پتہ نہ تھا۔

ج۔ جہاں تک سمجھ میں آسکا ہے یہ معصومیت کا لباس تھا۔ شجرِ ممنوعہ کا پھل کھاتے
ہی ان کو اپنے ستر کا احساس ہوا اور لگے جنت کے پتے توڑ توڑ کر چپکانے۔ اسی
مخصوص احساس کے باعث انسان کو لباس کی ضرورت پڑی جس کا بندوبست
اللہ نے دنیا میں کیا اور فرمایا ذٰلِكَ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ یہ اللہ کی نشانیوں میں
سے ہے کیونکہ سارے جانداروں میں سے لباس صرف انسان کو دیا گیا ہے۔

س۴۔ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ابلیس اور اس کا
قبیلہ تم کو دیکھتا ہے جہاں سے کہ تم ان کو نہیں دیکھتے۔ ابلیس کا قبیلہ جنّ کی قوم
ہے اُن کے دیکھنے کے تو بہت سے لوگ مدعی ہیں۔

ج۔ یہ نصِ صریح ہے کہ جنّ انسانوں کو نظر نہیں آتے۔ جو لوگ ان کو دیکھنے کا دعوے

کرتے ہیں اُن کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔

سؐ۔ لَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ ۔ منکر جنت میں داخل نہ ہوں گے یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں سے گذر جائے کیا قیامت میں اونٹ سوئی کے ناکہ میں سے گذر جائیں گے۔

ج۔ یہاں تعلیق المحال بالمحال ہے۔ یعنی جس طرح سوئی کے ناکہ میں سے اونٹ کا داخل ہونا ممکن نہیں اسی طرح ان منکروں کا جنت میں داخل ہونا ممکن نہیں۔

سؐ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدٰنَا لِھٰذَا ۔ اس اللہ کی حمد جس نے ہم کو اس کی ہدایت کی جنتی جنت میں پہنچ جانے کے بعد اللہ کی ہدایت پہ اس کی حمد کریں گے حالانکہ کرنا چاہئیے جنت ملنے پر۔

ج۔ یہاں ھَدٰنَا لِھٰذَا کا یہی مطلب ہے کہ ہم کو جنت میں پہنچا دیا۔ اس کے سمجھنے کے لئے ہدایت کے مفہوم کی کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔ یہ لفظ قرآن میں تین معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ سیدھے راستہ کی طرف بلانا۔ سیدھے راستہ سے لگا دینا۔ منزل تک پہنچا دینا۔ نبی اور رسول پہلے معنی میں ہادی ہوتے ہیں، وَاِنَّکَ لَتَھْدِیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (شوریٰ) بے شک تو سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ یہی بات دوسری جگہ ان لفظوں میں کہی گئی ہے وَاِنَّکَ لَتَدْعُوْھُمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (مومنون) بیشک تو ان کو سیدھے راستہ کی طرف بلاتا ہے یعنی انبیاء کی ہدایت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگوں کو سیدھے راستہ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اس معنی میں ہدایت کا صلہ بالعموم اِلٰی کے ساتھ آتا ہے۔ ہدایت کا دوسرا مفہوم یعنی راستہ سے لگا دینا انبیاء کی قدرت میں نہیں ہے اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (قصص) تو سیدھی راہ سے نہیں لگاتا جس کو چاہے۔ لیکن اللہ ہی جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ سے لگاتا ہے۔ یہاں ہدایت کا

لفظ بلا کسی صلہ کے آیا ہے۔ تیسرے معنی میں آیت ذیل میں استعمال ہوا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (یونس ۱) جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اللہ ان کو ایمان کی بدولت پہنچا دے گا نعمت کے باغات میں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ اس معنی میں صلہ فی آیا ہے۔ آیت بالا هَدٰنَا لِهٰذَا میں صلہ لِ کے ساتھ ہے۔ اس سے دونوں معنی نکل سکتے ہیں یعنی ہم کو سیدھے راستہ سے لگا دیا کہ ہم جنت میں پہنچ گئے یا یہ کہ ہم کو جنت میں پہنچا دیا اور چونکہ اہل جنت اس میں پہنچ جانیکے بعد حمد کر رہے ہیں۔ اس لئے قرین قیاس یہی آخری معنی ہے۔

س۔ وَنُوْدُوْا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ اہل جنت سے پکار کر کہہ دیا جائے گا کہ اس جنت کے تم وارث ہوئے اپنے اعمال کی بدولت۔ اعمال کی بدولت یا رحمت الٰہی کے بدولت؟ پھر وراثت کا لفظ کس لئے فرمایا گیا بخشش اور وراثت میں تو فرق ہے۔

ج۔ جنت ابو البشر کا پہلا گھر ہے۔ عصیان کی وجہ سے وہاں سے نکالے گئے۔ لیکن بتا دیا گیا کہ ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ سے تم پھر اس میں آسکتے ہو۔ اب ان کی اولاد میں سے جو لوگ اس میں پہنچیں گے وہ اپنے باپ ہی کے گھر میں تو پہنچیں گے۔ اسی کا نام وراثت ہے اور پہنچیں گے عمل صالح کی بدولت جس کا اعلان کرایا جائے گا باقی رہی رحمت تو اس کے اعلان کی کیا ضرورت ہے وہ تو شروع سے آخر تک چھائی ہوتی ہے۔ آدم کو جنت سے نکلنے کے بعد ہدایت دینا۔ اس کی یاد دلانے کے لئے دنیا میں سلسلہ وار رسولوں کا بھیجنا پھر عمل صالح میں یہ تاثیر رکھنا کہ ان کے ذریعہ سے انسان اپنی کھوئی ہوئی وراثت پا جائے یہ سب رحمت ہی کے کرشمے ہیں۔

س۔ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ اور اعراف میں کچھ لوگ ہوں گے۔ کیا آخرت میں

جنت دوزخ اور اعراف تین مقامات ہیں؟

ج۔ اعراف عارضی ہے اصل مقام دو ہی ہیں فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ (شوریٰ ۱) ایک فرقہ جنت میں اور ایک فرقہ دوزخ میں۔ اس آیت کے سوا اور کہیں قرآن میں اعراف کا ذکر نہیں ہے۔ یہاں بھی ان کی بابت ہے لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ وہ وہ جنت میں داخل نہیں ہوئے مگر اُمید رکھتے ہیں جو غالباً پوری کر دی جائے گی کیونکہ پھر ان کا کوئی ذکر نہیں آیا۔

س۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ سن رکھو خلق اور امر اللہ ہی کے لئے ہیں خلق یعنی ایجاد بے شک اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہے لیکن امر والیان امر کے ہاتھ میں بھی ہے

ج۔ یہاں خلق سے عالم مادی کی تخلیق مراد ہے اور امر سے اس کا انتظام اور تدبیر خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ (یونس ۱) پیدا کیا آسمان اور زمین چھ دنوں میں پھر وہ عرش پر براجا امر کی تدبیر کرتے ہوئے۔ سورہ حٰم سجدہ میں ہے کہ ہم نے دو دن میں زمین پیدا کی پھر دو دن میں اس میں پہاڑ اور روزی کے ذخیرے رکھے۔ اس کے بعد دو دن میں ساتوں آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اس کے احکام اتارے اور زمین یعنی پستی کے متعلق ہے خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ (طلاق ۲) اللہ نے پیدا کیں سات بلندیاں اور اسی قدر پستیاں۔ اترتا ہے امر ان کے درمیان۔ سورۂ سجدہ میں ہے يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ اللہ امر کی تدبیر کرتا ہے۔ آسمان سے زمین تک۔ اس طرح عالم مادی تمام تر عالم خلق ہے اور اس کے انتظامی اور تدبیری احکام عالم امر دو عالم الگ الگ ہیں اور دونوں حادث اور محدث ہیں بلکہ عالم امر عالم خلق کے بعد ہے۔ کیوں کہ بلندی اور پستی پیدا کرنے کے بعد الرحمان عرش پر مستوی ہوا ہے اور اوامر تدبیری

نازل کئے ہیں۔ اسی تدبیری امر کے ذیل میں امر تشریعی ہے بنی اسرائیل کے متعلق فرمایا
وَاٰتَیْنٰھُمْ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ (جاثیہ ۱۷) ہم نے ان کو امر (شریعت) کے متعلق کھلی
دلیلیں دیں۔ پھر خاتم النبیین سے اسی رکوع میں خطاب ہے ثُمَّ جَعَلْنٰکَ عَلٰی شَرِیْعَۃٍ
مِّنَ الْاَمْرِ۔ پھر ہم نے امر سے تجھ کو شریعت پر لگا دیا اور قرآن کے بارے میں
سورہ طلاق میں توضیح کر دی ذٰلِکَ اَمْرُ اللّٰہِ اَنْزَلَہٗ اِلَیْکُمْ یہ امر الٰہی ہے
جو اس نے تمہاری طرف اتارا۔

س ۱۰ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ رِسَالَۃَ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَکُمْ وَلٰکِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ ۰
اے میری قوم میں نے تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور تمہاری بھلائی چاہی لیکن تم
اپنے بھلا چاہنے والوں کو پسند نہیں کرتے حضرت صالح نے ہلاک شدہ قوم کو جن میں

لہ خلق قرآن کی جو بحث خلیفہ مامون عباسی کے عہد میں چھڑی تھی اور جس سے اس قدر شورش پیدا ہوئی تھی کہ عباسی خلافت متزلزل ہوگئی تھی وہ اس بنیاد پر تھی کہ محدثین قرآن کو غیر مخلوق کہتے تھے۔ اور معتزلہ سمجھتے تھے کہ غیر مخلوق کہنے سے وہ قدیم ہو جاتا ہے جس سے قدماء کا تعدد لازم آتا ہے اس وجہ سے وہ اس عقیدہ کو جو ان کے خیال میں توحید کے خلاف تھا مٹانے کے لئے نہایت سختی سے کام لیتے تھے بہت سے محدثین کو انہوں نے قید و بند میں ڈالا اور بہتوں کو قتل کیا افسوس یہ ہے کہ اس وقت فریقین میں سے کسی نے قرآن میں اچھی طرح غور نہیں کیا ورنہ معاملہ صاف ہو جاتا۔ یعنی قرآن امر تشریعی ہے وہ عالم امر سے ہے۔ اس لئے مخلوق نہیں کہا سکتا اور عالم امر چونکہ حادث ہے اس لئے قرآن غیر مخلوق کہہ دینے سے قدیم نہیں ہو جاتا۔ اس بحث پر ہم نے ایک جداگانہ مستقل مضمون لکھا ہے جو ہمارے مضامین کے مجموعہ میں ہے۔ نیز تاریخ الامت کے حصہ ہشتم میں بھی ہم نے اس کو بسط کے ساتھ لکھ دیا ہے۔

سننے کی صلاحیت ہی نہ تھی کیونکہ مخاطب فرمایا۔

ج ۔ ہلاک ہونے والے اُن کے ہم قوم تھے اور انسان کی فطرت ہے کہ اپنی قوم کی ہلاکت پر خواہ کسی جرم میں ہوئی ہو اس کے دل کو غم ہوتا ہے حضرت صالح کا یہ قول اپنے اسی غم کے دفعیہ کے لئے تھا۔ یہ بات اس سے اگلے رکوع میں حضرت شعیب کے قول سے زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ انہوں نے فرمایا یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ اے میری قوم میں نے اپنے رب کے پیغامات تم کو پہنچا دیئے اور تمہاری بھلائی چاہی سو میں کیا غم کروں نہ ماننے والوں پر۔ دراصل یہ ایک اسلوب بیان ہے اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے۔ ہلاک ہونے والوں کو مخاطب کرنا مقصود نہیں ہے۔

س ۱۴۳۔ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ حضرت موسیٰ نے اپنا عصا ڈال دیا وہ ایک دم اژدہا ہو گیا چشم دید۔ دوسری جگہ فرمایا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَانٌّ (قصص ۳۱) پھنکارتا ہوا جیسے سانپ اژدہا بھاری اور سست ہوتا ہے اور سانپ ہلکا اور چست۔ کیا ان میں تعارض نہیں ہے۔

ج ۔ حضرت موسیٰ کا عصا چرواہے کا بڑا لٹھ تھا جس سے وہ بڑے بڑے اونچے درختوں سے ٹہنیاں اور پتیاں اپنے جانوروں کے لئے گراتے تھے۔ اس لئے جسم کے لحاظ سے وہ اژدہا ہی تھا مگر تیزی اس میں چھوٹے سانپ کی تھی۔ یہ بات حرف تشبیہ کَاَنَّهَا سے ظاہر ہو جاتی ہے۔

س ۱۴۴۔ قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ (شعراء ۳۴) فرعون کی قوم کے سرداروں نے اپنے اردگرد کے سرداروں سے کہا کہ یہ بڑا واقف کار جادوگر ہے ایک ہی بات کی حکایت ہے مگر ایک جگہ اس کی نسبت سرداروں کی طرف ہے اور ایک جگہ خود فرعون کی طرف ہے۔

ج۔ فرعون نے کہا اور اسی بات کو سرداروں نے بھی کہا۔ اس لئے دونوں کی طرف منسوب کرنا صحیح ہے۔

س۱۵۔ قَالُوْا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۔ بنی اسرائیل نے کہا ہم ستائے گئے تیرے آنے سے پہلے اور تیرے آنے کے بعد بھی دونوں مرتبہ اپنی قومی مصیبت یعنی قتل ابناء کا انھوں نے حضرت موسیٰ کا ذمہ دار قرار دیا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ بات جو کہی جاتی ہے کہ فرعون نے خواب دیکھا تھا کہ اس کی سلطنت بنی اسرائیل کے ایک فرزند کے ہاتھ سے مٹ جائے گی اور اسی ڈر سے ان کے بیٹوں کو ذبح کرتا تھا۔ غالباً صحیح ہے۔ پھر دوبارہ جب حضرت موسیٰ جادوگروں پر غالب آگئے اور بنی اسرائیل کی عظمت قائم ہوگئی اس نے ان کے بیٹوں کو قتل کرنا شروع کیا۔

ج۔ قرآن میں اس خواب کا ذکر نہیں ہے پہلی بار جو فرعون نے بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ذبح کرنا شروع کیا تھا اس کی نسبت ہے يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِیْ نِسَاءَهُمْ (قصص ۱) فرعون ملک کی ایک جماعت کو کمزور کرنا چاہتا تھا ان کے بیٹوں کو ذبح کرتا تھا اور بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتا تھا۔ اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی کثرت تعداد کو اپنی سلطنت کے لئے خطرہ سمجھتا تھا اس لئے ان کے بیٹوں کو ذبح کرکے ان کی قوم کو کمزور بنانا چاہتا تھا نہ کہ کسی خواب کی بناء پر۔

س۱۶۔ وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۔ ہم نے وعدہ ٹھیرایا موسیٰ سے تیس راتوں کا اور اس کو پورا کیا دس ملا کر۔ تب پوری ہوئی اللہ کی مقررہ مدت چالیس رات۔ پہلے ہی کیوں نہ چالیس راتیں میقات کے لئے معین کی گئیں۔

ج۔ وعدہ تیس ہی راتوں کا تھا۔ اسی درمیان میں بنی اسرائیل میں گوسالہ کا فتنہ برپا ہوگیا جس کے انسداد کے لئے حضرت موسیٰ کو چند دنوں کے لئے واپس آنا پڑا۔ اس لئے دس راتیں اور بڑھائی گئیں اور میقات کی مدت چالیس رات ہوگئی۔ چنانچہ دوسری جگہ ہے وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً (بقرہ ع۶) اور جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے چالیس رات کا۔

س ع۱۷۔ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ مجھے نظر آکہ میں تجھے دیکھوں۔ حضرت موسیٰ اولوالعزم پیغمبر تھے وہ خوب جانتے تھے کہ آنکھوں سے اللہ کو دیکھنا ممکن نہیں۔ پھر ایسی ناممکن بات کا سوال کیوں کر بیٹھے۔

ج۔ یہ دید کا تقاضا عقل نہیں بلکہ عشق کی زبان سے تھا جو ممکن اور ناممکن میں فرق نہیں جانتا۔ اس سے موسیٰ کی عزت خالق اور مخلوق دونوں کی نگاہ میں بڑھ گئی۔ چنانچہ خالق نے تجلی منظور فرمائی اور مخلوق میں سے اہل دل جب اس ارنی اور لن ترانی کا تصور کرتے ہیں تو وجد میں آجاتے ہیں۔

س۔ اللہ نے پہلے موکد صیغہ لن ترانی فرمایا کہ تو ہرگز نہیں دیکھ سکے گا۔ پھر اس کے بعد تجلی کا وعدہ بھی کیا۔

ج۔ تجلی مشروط تھی کہ پہاڑ اپنی جگہ پر برقرار رہ جائے گا تو تم دیکھ سکو گے۔ لیکن نہ پہاڑ قائم رہ سکا نہ وہ دیکھ سکے۔ لیکن اس تجلی سے ان کی قلب ماہیت ہوگئی۔ چنانچہ جب ہوش میں آئے تو پکار اٹھے سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ تو پاک ہے میں تیرے آگے توبہ کرتا ہوں اور پہلا مومن ہوں جس کے بعد اللہ نے ان کو رسالت دی اور فرمایا اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ میں نے تجھ کو لوگوں میں سے چن لیا اپنے پیغامات اور اپنے کلام کے لئے۔

س ع۱۷۔ وَاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا۔ اے موسیٰ اپنی قوم کو حکم دے کہ لیں اس کی

بہتر باتیں۔ کیا آسمانی کتاب کی تعلیمات میں انتخاب ممکن ہے ؟

ج ۔ بِاَحۡسَنِهَا سے مراد بہتر باتیں نہیں بلکہ بہترین طریقے ہیں۔ یعنی اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیئے صحیح عقل کی روشنی سے کام لیں۔

س ۱۹ ۔ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيۡهِمُ الۡخَبَآئِثَ وہ نبی اُمّی اُن کے لیئے پاک چیزیں حلال کرے گا اور ناپاک چیزیں حرام۔ قرآن کی متعدد آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو اشیاء کی تحلیل اور تحریم کا حق نہیں ہے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار کوئی شے اپنے اوپر حرام کر لی تھی جس پر عتاب نازل ہوا يَآاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآاَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (تحریم ۱) جب وہ خود اپنے نفس پر کوئی چیز حلال یا حرام کرنے کا حق نہیں رکھتے تو اُمت پر کیسے کر سکتے ہیں۔ پھر یہاں تحلیل و تحریم نبی کی طرف کیوں منسوب کی گئی ۔

ج ۔ یہاں طیبات کی تحلیل اور خبائث کی تحریم جو نبی کی طرف منسوب کی گئی ہے اس سے مراد ہے باذن الٰہی ۔ چنانچہ دوسری جگہ اللہ نے نبی کو حکم دیا ہے قُلۡ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ (مائدہ ۱) کہہ دے کہ تمہارے لئے پاک چیزیں حلال کی گئیں ۔

س ۲۰ ۔ قُلۡ يَآاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ جَمِيۡعًا کہہ دے کہ اے انسانوں! میں تم سب کی طرف رسول ہوں ۔ یہاں یہ اعلان کس خاص وجہ سے کرایا گیا ۔

ج ۔ حضرت موسیٰ نے میقات پر اپنی قوم کے لئے رحمت الٰہی کی دعا کی تھی اللہ نے فرمایا تھا کہ میں اپنی رحمت سے ان کو نوازوں گا جو نبی اُمّی کی پیروی اور ان کی رفاقت اور امداد کریں گے ۔ اس لئے یہاں قرآن نے آنحضرت کی زبان سے اعلان کرایا کہ خاتم النبیین کی رسالت عام ہے اور یہ کسی ایک قوم ایک ملک یا ایک زمانہ کے لیئے نبی نہیں ہیں بلکہ ہر قوم ہر ملک اور ہر زمانہ کے لئے ہیں وَمَآاَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا (سبا ۲۸) تجھ کو ہم نے سارے انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر

بھیجا ہے۔ اسی لئے قرآن میں بنی اسرائیل سے بار بار رسول اور قرآن پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا گیا۔ یہاں تک کہ کہا گیا یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْھًا فَنَرُدَّھَا عَلٰٓی اَدْبَارِھَا (النسآء ۴۷) اے اہل کتاب ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے اُتارا ہے اور جو تصدیق کرتا ہے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے قبل اس کے کہ ہم تمہارے چہروں کو مسخ کر کے گدّی کی طرف پھیر دیں۔

س۔ جَعَلَا لَہٗ شُرَکَآءَ فِیْمَآ اٰتٰھُمَا اُن دونوں نے اللہ کی دی ہوئی چیز میں اُس کے شریک ٹھہرائے۔ یہاں ذکر ہے آدم اور حوّا کا اور نبی تو شرک سے پاک ہوتا ہے۔

ج۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ یہاں فرد مراد نہیں ہے بلکہ جنس ہے۔ آیت کے شروع میں خَلَقَکُمْ اور آخر میں یُشْرِکُوْنَ دونوں میں ضمیریں جمع کی ہیں جن سے اس کا اشارہ ملتا ہے۔ یعنی یہ خود آدم و حوّا کا قصّہ نہیں ہے بلکہ بنی آدم میں سے لوگ ایسا کرتے ہیں۔

سورۂ انفال

س ۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ ایمان والے وہی لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر ہو ان کے دل ڈر جائیں۔ دوسری جگہ ہے تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ (رعد ۲۸) مومنوں کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں۔ ایک جگہ خوف ایک جگہ اطمینان اس میں تعارض کا وہم ہوتا ہے۔

ج ۔ خوف اور اطمینان سبب اور نتیجہ ہیں جو ایک دوسرے پر مترتب ہیں تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۔ (زمر ۲۳) جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ قرآن سن کر ان کی کھالوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر نرم پڑ جاتی ہیں اُن کی کھالیں اور اُن کے دل اللہ کی یاد سے۔ ذکر سے خشیت الٰہی اور اس سے سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔

س ۔ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۔ تم نے اُن کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا۔ اور اے نبی تو خاک تم نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی حالانکہ قتل مسلمانوں نے کیا تھا اور خاک نبی نے پھینکی تھی۔

ج ۔ کفار کے مقتول اور گرفتار ہونے کا بڑا سبب چونکہ ملائکہ تھے جن کو اللہ نے مدد کے لئے نازل کیا تھا اس لئے ان امور کو اپنی طرف منسوب فرمایا تھا۔

س ۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو۔ اللہ و رسول کے لئے عنہ کی ضمیر تثنیہ چاہئیے۔

ج ۔ "اللہ و رسول" سے مراد یہاں اور نیز اُن تمام آیتوں میں جن میں ان کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے ایک ہی چیز یعنی مرکزِ ملت ہے ۔ اس کو سمجھنے کے لئے ایک مختصر توضیح کرنا ضروری ہے[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ممتاز منصب تھے ۔

(۱) منصب پیغمبری ۔ یعنی پیغام الٰہی کو انسانوں کے پاس بے کم و کاست پہنچا دینا ۔ اس کے امتیازات یہ ہیں ۔

۱ ۔ اس منصب کی رُو سے آپ کی تصدیق کرنا اور آپ کے اوپر ایمان لانا فرض کیا گیا اور یہ اُمت ہمیشہ کے لئے آپ ہی کی امت ہوئی ۔

۲ ۔ یہ پیغمبری آپ کی ذات پر ختم کر دی گئی اور اس کی تکمیل کے لئے آپ بھیجے ہی گئے ۔

۳ ۔ اس حیثیت سے آپ کو کسی سے مشورہ لینے کا حکم نہ تھا بلکہ اللہ کی طرف سے صرف فریضۂ تبلیغ لازم کیا گیا تھا ۔

(۲) منصب امامت ۔ یعنی احکام الٰہی کے مطابق لوگوں کو چلانا ۔ ان کے باہمی تنازعات اور قضایا کے فیصلے کرنا ۔ اجتماعی امور مثلاً جنگ و صلح وغیرہ میں ان کی قیادت و نمائندگی وغیرہ اس کے امتیازات یہ ہیں ۔

۱ ۔ یہ امامت کبریٰ جو آپ نے بنی نوع انسان کی ہدایت و رہنمائی و اصلاح و فلاح کے لئے قائم کی آپ کی ذات اور زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ قیامت تک مستمر ہے جو آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعہ سے قائم رہنی چاہیئے ۔

۲ ۔ آپ کے بعد آپ کے خلفاء یعنی زندہ جانشینوں کے وہی اختیارات ہوں گے جو اس لحاظ سے آپ کے تھے اور ان کی اطاعت بعینہٖ اللہ و

---

[1] اس عنوان پر مفصل بحث ہم نے اپنی کتاب تاریخ الامت حصہ ہشتم کے مقدمہ میں لکھ دی ہے ۔

رسول کی اطاعت ہو گی۔[1]

۳۔ اس لحاظ سے آپ مامور تھے کہ لوگوں سے مشورہ لیں۔

قرآن میں جو احکام رسول کی اطاعت کے ہیں وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ منصب کے لئے ہیں جس میں آپ کے بعد آنے والے جملہ خلفاء داخل ہیں اور ان کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن نے مرکز ملت کے لئے یہی لفظ یعنی "اللہ و رسول" استعمال کیا ہے۔

س۔ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ اللہ ایسا نہیں کہ مشرکوں پر عذاب کرے جبکہ تو ان میں موجود ہے۔ بدر میں رسول اللہ موجود تھے پھر اللہ نے مشرکوں پر کیوں عذاب کیا۔

ج۔ مراد مکہ ہے نہ کہ بدر کا میدان جنگ جبکہ مسجد حرام سے مسلمانوں کو روکنے کا جرم مشرکوں پر عائد ہو چکا تھا۔ جیسا کہ آگے کی آیت میں ہے وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اور کیوں نہ اللہ ان پر عذاب کرے وہ تو مسجد حرام سے روکتے ہیں۔

س۔ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ۔ اور ان کافروں کی نماز کعبہ کے پاس کچھ نہ تھی سوائے سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے۔ ان چیزوں پر نماز کا اطلاق کیوں کیا گیا۔

ج۔ بول چال کے مطابق اس کا مطلب یہ ہوا کہ بجائے نماز کے یہی کچھ کرتے تھے۔

س۔ وَيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ اور تم کو تھوڑا دکھایا اللہ نے ان کی آنکھوں میں

---

[1] اطاعت کے معنی ہیں کسی زندہ کی فرمانبرداری کرنا مردہ کی فرمانبرداری کے لئے یہ لفظ ساری عربی زبان میں کہیں مستعمل نہیں ہوا ہے۔

کافروں کو مسلمانوں کی نگاہوں میں تھوڑا دکھانے کی تو مصلحت سمجھ میں آتی ہے کہ وہ مرعوب نہ ہوجائیں۔ مگر مسلمانوں کو کافروں کی نگاہوں میں تھوڑا دکھانا کس غرض سے تھا وہ تو یونہی تھوڑے تھے۔

ج۔ تاکہ وہ مسلمانوں کو تھوڑا دیکھ کر بے پرواہ ہوجائیں اور لڑائی کی زیادہ تیاری نہ کریں۔

س۶۔ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔ شیطان نے قریش کو گھمنڈ میں پھنسا کر مسلمانوں سے لاکر بھڑادیا۔ اب ان سے الگ ہوکر کہتا ہے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔ یہ کس قسم کا خوف ہے کیا اس کو فرشتے نظر آگئے تھے؟

ج۔ اس نے اس خوف کی وجہ تو یہی بیان کی کہ میں وہ چیز دیکھ رہا ہوں جس کو تم نہیں دیکھتے مگر اس کو سچا سمجھنے کی ضرورت کیا ہے۔ خوف کے اس دعوے میں بھی وہ جھوٹا ہوسکتا ہے۔ اس کا تو قرآن میں یہی شیوہ بیان کیا گیا ہے کَمَثَلِ الشَّیْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اکْفُرْ فَلَمَّا کَفَرَ قَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (حشر ۲) جیسے شیطان کہ وہ انسان سے کہتا ہے کفر کر۔ جب انسان کفر کرلیتا ہے تو شیطان کہتا ہے میں تجھ سے بری ہوں۔ میں اللہ سے جو سارے جہان کا پروردگار سے ڈرتا ہوں۔

س۹۔ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ اگر تم میں سے بیس صبر کرنے والے ہوں گے تو دوسو پر غالب آجائیں گے۔ پھر فرمایا کہ اب تم میں کمزوری آگئی ہے۔ لہٰذا تم میں سے سو صبر کرنے والے دوسو پر غالب آئیں گے ان دونوں آیتوں میں تضاد سمجھ کر بعضوں نے پہلی کو منسوخ اور دوسری کو ناسخ کہہ دیا ہے۔

ج۔ قرآن کی موجودہ آیات میں سے ایک آیت بھی منسوخ نہیں ہے۔ جیسا کہ سورہ بقرہ میں لکھا جاچکا ہے اور ان دونوں آیتوں میں تو باہم تضاد بھی نہیں ہے کیونکہ

دونوں کے زمانے مختلف ہیں۔ اس لئے دونوں کے احکام بدستور باقی ہیں جیسا
موقع ہوگا اسی کے لحاظ سے عمل ہوگا اگر مسلمانوں کی تعداد کم ہے تو سو کے مقابلے
میں دس جائیں گے اور یہ خودکشی نہ ہوگی اور زیادہ ہوں گے تو پچاس جائیں گے۔
اور ثابت قدم رہیں گے تو حسب وعدۂ الٰہی فتحیاب ہوں گے۔

سورۂ توبہ

س۱۲۔ قَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ کفر کے سرغنوں سے لڑو۔ کیا عوام سے نہیں ؟
ج۔ ائمہ سے مراد یہاں وہ سردار ہیں جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنا شیوہ بنایا تھا اور اپنے عہد کو توڑ ڈالا تھا ان کے ساتھ لڑنے کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے حامیوں سے بھی لڑو۔

س۶۱۔ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ رسول اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور مومنوں کی تصدیق کرتا ہے۔ یومن کا ایک جگہ صلہ ب ہے اور دوسری جگہ لام۔ یہ فرق کس فائدہ کے لئے ہے ؟
ج۔ عام طور پر قرآن میں آمن کا صلہ جہاں ب ہے وہاں ایمان لانا اور جہاں ل ہے وہاں تصدیق کرنا مراد ہے لیکن کہیں کہیں دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے ۔ مثلاً فرعون نے جادوگروں سے کہا کہ تم بغیر میری اجازت کے موسیٰ پر ایمان لائے اس کے لئے سورۂ اعراف میں اٰمَنْتُمْ بِهٖ اور سورہ طٰہٰ اور سورہ شعراء میں اٰمَنْتُمْ لَهٗ ہے۔

س۶۴۔ يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ ۔ منافق ڈرتے ہیں کہ اُن کے اوپر کوئی سورہ نہ نازل ہو جائے ۔ سورہ تو نبی پر نازل ہوتی تھی نہ کہ منافقوں پر۔
ج۔ یہاں علیٰ کے معنی ہیں فی کے یعنی اُن کے بارے میں جیسے سورہ بقرہ میں ہے عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ حضرت سلیمان کی سلطنت کے بارے میں۔

س۶۷۔ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ منافق اللہ کو بھول گئے سو اللہ ان کو بھول گیا ۔ لیکن

اللہ تو بھولنے والا نہیں لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی (طٰہٰ ۲) میرا رب نہ بہک سکتا ہے نہ بھولتا ہے۔

ج۔ پہلے بھی اس کا ذکر آچکا ہے۔ اللہ کے بھولنے سے مراد ہے بھولنے والے کو سزا دینا۔ قرآن میں ہے قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْٓ اَعْمٰی وَقَدْ کُنْتُ بَصِیْرًا۔ قَالَ کَذٰلِکَ اَتَتْکَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیْتَھَا وَکَذٰلِکَ الْیَوْمَ تُنْسٰی (طٰہٰ ۷) وہ کہے گا کہ اے میرے رب مجھے تو نے اندھا کیوں اٹھایا میں تو بینا تھا۔ اللہ فرمائے گا ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ تیرے پاس ہماری آیتیں آئیں تو نے ان کو بھلا دیا اسی طرح آج تو بھلا دیا جائے گا۔

س ۱۲۔ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ کُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا یَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ۔ بدو کفر اور نفاق میں بہت کٹر ہیں اور اسی لائق ہیں کہ نہ جان سکیں وہ قاعدے جو اللہ نے اپنے رسول پر اتارے ہیں۔ پھر ایسے جاہلوں کے اشعار سے قرآن سمجھنے میں کیوں سند لی جاتی ہے۔

ج۔ ان کے اشعار سے قرآن کے احکام پر نہیں بلکہ الفاظ پر سند لائی جاتی ہے جو ان کی زبان کے ہیں اور جس کے وہ ماہر تھے۔

س ۱۴۔ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَہٗٓ اَنَّہٗ عَدُوٌّ لِّلّٰہِ تَبَرَّاَ مِنْہُ۔ جب ابراہیمؑ کو معلوم ہو گیا کہ ان کا باپ اللہ کا دشمن ہے انہوں نے اس سے برائت کر لی۔ حضرت ابراہیم کو پہلے ہی سے علم تھا کہ ان کے باپ مشرک ہیں اور یہ جانتے ہوئے انہوں نے دعا کی تھی وَاغْفِرْ لِاَبِیْٓ اِنَّہٗ کَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ (شعراء ۵) میرے باپ کو بخشدے وہ گمراہوں میں سے تھا۔

ج۔ حضرت ابراہیم کو اُن کے باپ نے جب گھر سے نکالا تھا تو انہوں نے فرمایا سَاَسْتَغْفِرُ لَکَ رَبِّیْ (مریم ۳) میں تمہارے لئے اپنے رب سے مغفرت مانگوں گا

چنانچہ اُن کے لئے مغفرت مانگی جس کا ذکر سورۃ ابراہیم میں بھی ہے اور سورۂ شعراء میں بھی۔ اس میں کیا شبہ کہ وہ اپنے باپ کے مشرک ہونے کو جانتے تھے لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے لئے موحدوں کو مغفرت نہیں مانگنی چاہیئے۔ یہاں خاتم النبیین اور مومنوں کو بھی اس بات کی تلقین کی گئی۔

۱۲۴
س۔ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اُن کے ایمان کو جو سورت اُترتی ہے زیادہ کرتی ہے۔ جابجا قرآن تصریح کرتا ہے کہ ایمان میں زیادتی ہوتی ہے۔ پھر بعض مسلم فرقے یہ عقیدہ کس بنیاد پر رکھتے کہ ایمان نہ بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے۔

ج۔ اُن کے امام نے یہ بات کہہ دی ہے اب وہ اپنے امام کے قول کی تاویل کے بجائے آیاتِ الٰہی میں تاویلیں کرتے ہیں۔

سورۂ یونس

س[1]۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۔ جو لوگ ہماری آیتوں سے بے خبر ہیں ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ کیا بے خبری عذر نہیں ہے۔

ج۔ عذر ہوتی تو جہنمی کیوں ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جن و انس کی بڑی تعداد جہنم ہی کے لئے پیدا کی ہے وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ (اعراف ۲۲) ہم نے پیدا کئے ہیں دوزخ کے لئے بہت سے جن و انس[1]۔ ان کو آیات الٰہی پہنچیں یا نہ پہنچیں ایمان لانے کی توفیق نہیں ہوتی۔ اور نہ ہر کوئی جان کر کھائے یا بے جانے بہرصورت قائل ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت دیدیتا مگر یہ اس کی مشیت نہیں ہے وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ○ (السجدہ ۲) اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو اس کی سیدھی راہ دکھا دیتے۔ لیکن میں نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ جہنم کو جن و انس سے اکٹھا ضرور بھر دوں گا۔

س۔ اس صورت میں جن کو آیات پہنچیں اور انہوں نے بے خبروں کو تبلیغ نہیں کی وہ بھی مجرم قرار پاتے ہیں۔

ج۔ تبلیغ مسلمانوں پر جماعتی فرض یعنی فرض کفایہ ہے۔ انہوں نے جب تک اس فرض کو ادا کیا اللہ ان کو اور ان کے دین کو عروج دیتا رہا۔ کچھ زمانہ کے بعد وہ تخت و تاج

---

[1] جن و انس دونوں لفظ جہاں جہاں قرآن میں ساتھ ساتھ آئے ہیں ان سے انسانوں ہی کے دو مختلف طبقے مراد ہیں۔ آئندہ کسی موقع پر اس کا ذکر آئے گا۔

کی لذت اور جاہ و مال کی حرص میں پڑ کر اس فریضہ سے غافل ہوگئے جس کی سزا میں اللہ نے ان نعمتوں کو جو ان کو دیا تھا ان سے چھین لیا۔ اور جن کو تبلیغ نہیں کی تھی انہیں کے ہاتھوں ان کو ذلیل و خوار کرادیا۔

س۲۔ وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ، قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ اور اللہ کے سوا پوجتے ہیں ان کو جو نہ ان کو نقصان پہنچاتے ہیں نہ نفع۔ اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے یہاں۔ کہدے کہ کیا تم اللہ کو خبر دیتے ہو ان کی جو اس کو معلوم نہیں آسمانوں میں نہ زمین میں۔ قرآن کے مترجموں نے اس آیت کا یہی ترجمہ کیا ہے اور اکثر مفسروں نے بھی لایعلم کا فاعل اللہ ہی کو قرار دیا ہے یعنی لاعلمی اس کی طرف منسوب کی ہے۔

ج۔ اللہ کی طرف کسی جہت سے بھی لاعلمی منسوب کرنا بہت بڑی جسارت ہے درانحالیکہ قرآن تصریح کے ساتھ کہتا ہے إِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ (عنکبوت ع۲) جس چیز کو بھی وہ اللہ کے ماسوا پکارتے ہیں اس کو اللہ جانتا ہے۔ آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے۔ کیا تم اللہ کو پہنچاتے ہو ان کے ذریعہ سے جن کو آسمانوں اور زمین کی کسی شئے کا علم نہیں در حقیقت مشرک اپنے اور اللہ کے درمیان اپنے معبودوں کو واسطے بناتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ اللہ کے یہاں ہماری سفارش کریں گے۔ قرآن نے کہا کہ ان کو کسی شئے کا علم ہی نہیں ہے وہ تمہاری خبر اللہ کو کیا دیں گے اور کیا سفارش کریں گے۔

س۳۔ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ جس دن ہم سب کو جمع کریں گے مشرکوں سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے شرکاء اپنی جگہ پر رک جاؤ۔ دوسری جگہ ہے لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ

یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ (آلِ عمران ۸) قیامت کے دن اللہ نہ ان سے بات کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا۔ ان میں تعارض کا خیال ہوتا ہے۔

ج ۔ قیامت میں حالات اور مواقع مختلف ہوں گے کہیں کچھ ہوگا کہیں کچھ۔ یہ سب باتیں ایک وقت اور ایک موقع کی نہیں ہیں کہ ان کو باہم متعارض کہا جائے۔

س ۔ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّثْلِہٖ ۔ کہہ دے کہ قرآن جیسی ایک ہی سورہ بنا لاؤ۔ یہاں ایک ہی سورہ بنانے کا مطالبہ ہے اور اس سے اگلی سورہ میں دس سورتوں کا۔

ج ۔ جابجا قرآن نے منکروں کو تحدّی کی ہے کہ تم قرآن جیسا کلام نہیں بنا سکتے۔ کہیں دس سورہ۔ کہیں ایک سورہ اور کہیں ایک ہی آیت فَلْیَاْتُوْا بِحَدِیْثٍ مِّثْلِہٖۤ اِنْ کَانُوْا صٰدِقِیْنَ (طور ع۲) اگر وہ سچے ہیں تو ایک ہی بات قرآن جیسی بنا کر لائیں۔ وہ اس پر بھی قادر نہ ہو سکے۔

س ۔ وَمَا تَکُوْنُ فِیْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْہُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا کُنَّا عَلَیْکُمْ شُہُوْدًا تو جس حال میں ہوتا ہے اور جس میں قرآن پڑھتا ہے اور جو کام تم کرتے ہو۔ ہم ضرور تمہارے پاس موجود ہوتے ہیں۔ کیا بات ہے کہ پہلی دو باتوں کا خطاب رسول اللہ سے ہے اور تیسری میں پوری امت شریک کر لی گئی ہے۔

ج ۔ تیسرے فعل کو جمع لا کر یہ ظاہر کر دیا کہ پہلے دونوں میں بھی اگرچہ خطاب صرف نبی سے ہے۔ پوری امت شریک ہے۔ بولنے کا یہ اسلوب بلاغت کے لحاظ سے کلام میں قوت پیدا کرنے کا سبب ہوتا ہے۔

س ۔ وَمَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّکَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ۔ تیرے رب کی نظر سے زمین اور آسمان کا ایک ذرہ بھی اوجھل نہیں ہے یہاں زمین پہلے ہے اور آسمان بعد۔ اور بعینہٖ یہی بات سورہ سبا میں ہے وہاں آسمان پہلے ہے اور زمین بعد۔

ج ۔ یہاں اعمال کا ذکر ہے جس کا محل زمین ہے۔ اس لئے اس کا ذکر پہلے لایا گیا اور سورۂ سبا میں قیامت کا بیان ہے جو پہلے بلندی سے شروع ہوگی یعنی آسمان شق ہوگا اور ستارے ٹوٹ پڑیں گے۔

س ۹ ۔ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً ۔ آج ہم تیرے بدن کو نکالے دیتے ہیں کہ تو آنے والوں کے لئے نشانی بنے۔ فرعون نے ڈوبتے وقت توحید کا کلمہ پڑھا اور اپنے کو مسلمان کہا۔ اللہ نے اس پر فرمایا کہ ہم تیرے جسم کو نجات دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن نے قطعی فیصلہ کر دیا ہے جیسا کہ پہلے گذر چکا کہ موت کے وقت کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ مگر فرعون کے لئے تو وہ کارآمد ہوئی کہ اس کے جسم کو اللہ نے نجات دے دی۔

ج ۔ جسم کی نجات کا کیا نجات ہے۔ اگر روح کو بھی نجات نہ ہوئی۔ اور سمندر کے پانی سے نجات کیا نجات ہے اگر جہنم کی آگ سے نجات نہ ہوئی۔ پھر یہ نجات بھی اس کے فائدہ کے لئے نہ تھی بلکہ اس لئے ہوئی کہ آئندہ نسلیں اس سے عبرت حاصل کریں[1]

س ۱۰ ۔ فَإِنْ كُنْتَ فِي شَكٍّ مِمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ ۔ اگر تجھ کو اس میں شک ہو جو ہم نے تیری طرف اُتارا ہے الآیہ۔ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جو یقیناً شک سے بری تھے۔

---

[1] غرق ہو جانے کے بعد جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے فرعون کی لاش سمندر سے نکالی گئی۔ مصریوں نے اپنے اس زمانہ کے دستور کے مطابق ممی بنا کر اس کو ایک تہ خانہ میں محفوظ کر دیا۔ بیسویں صدی کے آغاز ۱۹۰۲ء میں وہ برآمد ہو گئی۔ علم الآثار والوں نے ثبوت مہیا کر لیا ہے کہ یہ وہی فرعون ہے۔ جو بنی اسرائیل کا پیچھا کرتے ہوئے سمندر میں غرق ہوا تھا۔ اب اس خدائی کے مدعی بے جان جسم جیزہ کے انتیقہ خانہ خدیوی میں اہل نظر کے لئے عبرت کا تماشا ہے۔

ج ۔ خطاب بے شک نبی سے ہے۔ لیکن روئے سخن شک کرنے والوں کی طرف ہے
چنانچہ اس کے بعد ہے قُلْ یَاَیُّھَا النَّاسُ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ شَکٍّ مِّنْ دِیْنِیْ کہدے
کہ لوگو! اگر تم کو میرے دین میں شک ہے۔ الآیہ

س ۔ وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ کُلُّھُمْ جَمِیْعًا ۔ اگر تیرا
رب چاہتا تو جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کے سب ایمان لاتے کُلُّھُمْ کے
بعد جَمِیْعًا کس ضرورت سے لایا گیا؟ اور مشیت میں کیوں سب کی ہدایت
نہیں رکھی گئی۔

ج ۔ لفظ کل کا احاطہ کے لئے ہے اور جمیع کا شمول کے لئے۔ یعنی سارے اکٹھے ۔ دونوں
کا ایک ساتھ استعمال جملہ کو مؤکد کر دیتا ہے ۔ رہی مشیت تو وہ ہمارے چون و
چرا سے بالاتر ہے۔ خود اللہ ہی نے اس کی وجہ بیان فرمائی ہے وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا
کُلَّ نَفْسٍ ھُدٰھَا، وَلٰکِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ لَاَمْلَئَنَّ جَھَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ
اَجْمَعِیْنَ (سجدہ ع۲) اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت دے دیتے۔ لیکن میرا فیصلہ
ہو چکا ہے کہ ضرور میں دوزخ کو بھر دوں گا جن و انس سے۔

سورۂ ھود

س۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا جو بھی زمین پر چلنے والا ہے اس کی روزی اللہ کے ذمہ ہے۔ یہاں فی سے زیادہ علیٰ کا موقع معلوم ہوتا ہے کیونکہ دابۃ اسی کو کہتے ہیں جو زمین پر چلتا ہے نہ کہ زمین میں۔

ج۔ فی علیٰ کے معنی میں آتا ہے لَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِي جُذُوعِ النَّخْلِ (طٰہٰ ۳۱) میں تم کو سولی دُوں گا کھجور کے ڈھنڈ پر۔ یہاں فی اس لئے لایا گیا ہے کہ اس سے معنی میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ جاندار بھی آجاتے ہیں جو زمین کے اندر ہیں۔

س۔ وَلَئِنْ قُلْتَ إِنَّكُمْ مَبْعُوثُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ ۝ اگر تو کہے کہ تم مرنے کے بعد اُٹھائے جاؤ گے تو وہ ضرور کہیں گے کہ یہ کھلا ہوا جادُو ہے۔ کون سی چیز جادُو ہے؟

ج۔ سحر کے معنی جادو کے بھی ہیں اور جھوٹ کے بھی۔ یہاں اس کے معنی جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتے اور ایسے متعدد مقامات قرآن میں ہیں جہاں سحر کے معنی جھوٹ کے ہیں مگر لوگوں نے جادو ترجمہ کرکے اُن آیات کے مفہوم کو بگاڑ دیا ہے۔

س۔ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي اے زمین اپنا پانی نگل جا۔ اور آسمان تھم جا۔ بے جان زمین اور آسمان کو خطاب کرکے حکم دینے کے کیا معنی ہوئے۔

ج۔ خطاب ہے عالم ملکوت کے کارکنوں سے جو ان چیزوں پر موکل ہیں۔ اور اسی کو امر تکوینی کہتے ہیں۔ کُن فَیَکُون۔

سؑ ۔ تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تجھ کو وحی کرتے ہیں۔ یہاں مونث کی ضمیر ہے اور سورۂ آل عمران نیز سورۂ یوسف میں ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ مذکر کی ضمیر ہے۔

ج ۔ انباء کا لفظ جمع ہے اور جمع کے لئے مذکر اور مؤنث دونوں ضمیریں آسکتی ہیں۔

س ۔ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ جب حشر کا دن آئے گا تو کوئی شخص اللہ کی اجازت کے بغیر نہیں بولے گا۔ دوسری جگہ ہے يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا (نحل ۱۵) اس دن آئے گا ہر شخص اپنی طرف سے مدافعت کرتے ہوئے۔ پھر سورۂ مرسلات میں ہے هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ یہ وہ دن ہے کہ نہ بولیں گے اور نہ ان کو اجازت دی جائے گی کہ معذرت کریں۔ ان آیات میں باہم تضاد کا خیال ہوتا ہے۔

ج ۔ پہلے بھی ایک سوال اسی قسم کا آچکا ہے۔ جواب سب کا ایک ہی ہے یعنی قیامت میں حالات اور مقامات مختلف ہوں گے۔ کہیں ان کو بولنے کی اجازت دی جائے گی اور کہیں ان کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی۔ اور ہاتھ پاؤں گواہی دیں گے۔

سؑ ۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اس میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین ہیں۔ یہاں اہل جنت وجہنم دونوں کا خلود آسمان و زمین کے قائم رہنے تک مقید کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ ہر جگہ قرآن نے اس کو مطلق رکھا ہے۔

ج ۔ اصولاً یہی قید ہر جگہ لگ جائے گی اور ان کے خلود کی میعاد اسی مدت معینہ تک کے لئے ہوگی جو آسمان اور زمین کے لئے ہے مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى (احقاف ۱) ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے حق کے ساتھ ایک مدت مقررہ کے لئے پیدا کیا ہے۔ قیامت

میں آسمان اور زمین بدل جائیں گے۔ لیکن ان کے مدت معینہ سے خارج ہونے پر کوئی دلیل قائم نہیں ہے۔

س۔ وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ۔ اور وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے بجز ان کے جن پر اللہ نے رحم کیا اور اسی لئے ان کو پیدا کیا ہے اور پوری ہو کر رہے گی بات تیرے رب کی کہ میں ضرور بھر دوں گا جہنم کو جن و انس سب سے۔ کس لئے پیدا کیا ہے اختلاف کے لئے یا رحم کے لئے؟

ج۔ عرش پر الرحمٰن براج رہا ہے اس نے رحمت ہی کے لئے پیدا کیا ہے لیکن جن و انس کی کثیر تعداد دوزخ کے لئے بنائی گئی ہے۔ وہ لامحالہ اختلاف کرتے رہیں گے اور انہیں سے دوزخ بھری جائے گی جو اختلاف سے بچیں گے وہ رحمتِ الٰہی میں جگہ پائیں گے وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِن يُدْخِلُ مَن يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ (شوریٰ) اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن جس کو چاہتا ہے اسی کو اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے۔ یہاں سے اختلاف کے معنی بھی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ یعنی دین الٰہی سے اختلاف۔

سورۂ یوسف

س۱۔ یَرْتَعْ وَ یَلْعَبْ چرے اور کھیلے۔حضرت یوسف کے بھائیوں نے باپ سے ان کو ساتھ لے جانے کی اجازت مانگتے ہوئے ان کے لئے ایسا لفظ کیوں استعمال کیا۔جو حیوان کے لئے بولا جاتا ہے۔

ج ۔ یوسف علیہ السلام اس وقت نابالغ بچے تھے۔ان کے کھانے کے لئے استعارتاً ایسا لفظ بولنے میں کیا قباحت ہے۔

س۲۔ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ تم اس کو لے جاؤ گے تو مجھے دکھ ہو گا۔اور میں ڈرتا ہوں کہ اُسے بھیڑیا کھا جائے گا۔دو عذر حضرت یعقوب نے بیان فرمائے۔یوسفؑ کے بھائیوں نے صرف ایک کا جواب دیا کہ ہمارے ہوتے ہوئے بھیڑیا کیسے کھا جائے گا۔مگر دوسرے کا جواب نہ دیا۔

ج ۔ وہی تو اصل وجہ ان کو لے جانے کی تھی کہ باپ ہر وقت ان کو سامنے رکھتا تھا۔ اسی لئے قصداً اس کا جواب نظر انداز کیا۔

س۳۔ وَاَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِ ہم نے یوسفؑ کو وحی کی۔یوسفؑ اس وقت بچے تھے اور وحی تو چالیس سال کی عمر میں ہوتی ہے۔

ج ۔ یہ وحی رسالت نہ تھی بلکہ خود ان کے لئے ذاتی الہام تھا۔جیسے حضرت موسیٰ کی والدہ کی طرف بھیجی گئی تھی۔

س۴۔ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا جب وہ اپنی قوت کو پہنچا ہم نے اس کو علم اور حکمت دی اور حضرت موسیٰ کے بارے میں ہے

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰىۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (قصص ۲) جب وہ پہنچا اپنی قوت کو اور سنبھل گیا ہم نے اس کو علم اور حکمت دی۔

ج۔ بلوغ اشد پوری جوانی کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس پہ استوی کا اضافہ کمال عقل کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو جس عمر میں حکم اور علم عطا ہوا اسیتنا اس سے کم عمر میں حضرت یوسفؑ کو ملا تھا۔

س۴۔ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا۔ زلیخا کے لوگوں میں سے ایک نے گواہی دی اس نے بتایا تھا کہ یوسفؑ کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہو تو وہ مجرم ہیں اور پیچھے پھٹی ہو تو زلیخا۔ یہ تو ایک علامت تھی۔ اس کو شہادت کے لفظ سے کیوں تعبیر کیا۔

ج۔ اس کے بیان سے چونکہ حضرت یوسفؑ کا قول پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا۔ اس لئے اس کو شہادت کہا کیونکہ شہادت کا مقصد ثبوت ہی ہوتا ہے۔

س۴۔ اُخْرُجْ عَلَيْهِنَّ نکل آن کے سامنے۔ خرج کے ساتھ عام طور پر الیٰ مستعمل ہوتا ہے یہاں علیٰ کیوں لایا گیا۔

ج۔ جہاں اہمیت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ وہاں علیٰ استعمال کرتے ہیں جیسے قارون کے متعلق ہے فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِىْ زِيْنَتِهٖ (قصص ۸) نکلا اپنی قوم کے سامنے زیب وزینت کے ساتھ۔

س۵۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ اللہ نے حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کے بندے نہ بنو۔ امر کی تفسیر نہی کے ساتھ کیا معنی رکھتی ہے۔

ج۔ نہی حصر کی صورت میں امر ہی کا فائدہ دیتی ہے۔ مطلب اس کا وہی ہے جو اللہ نے دوسرے مقامات میں فرمایا ہے کہ میرے ہی بندے بنو۔

س۔ قَالَ اجْعَلْنِىْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ یوسفؑ نے کہا کہ مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کر دے۔ انبیاء کی نگاہ میں دنیا کی کیا قدر ہے جو اس کے لئے

درخواست کی۔

ج۔ تاکہ عدل اور غریبوں کی بہبودی کر کے اللہ کی رضا حاصل کریں۔ چنانچہ اللہ نے بھی اپنے اس احسان کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ اس طرح ہم نے یوسفؑ کو ملک میں اختیار عطا فرمایا۔

س ۹۔ اَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ۔ اے قافلہ والو۔ تم ضرور چور ہو۔ حضرت یوسفؑ کو معلوم تھا کہ وہ چور نہیں ہیں۔ پھر اُن کے اُوپر الزام کیوں لگایا؟

ج۔ بظاہر شکل سرقہ کی تھی اور اس سے مقصود قافلہ والوں کو چور بنانا نہیں تھا بلکہ صرف اپنے حقیقی بھائی کو اپنے پاس رکھنے کے لئے ملزم گردانا تھا جس کو انہیں پہلے ہی سے سمجھا دیا تھا۔

س ۹۔ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاءُ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ۔ ہم جس کے درجے چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں۔ اور ہر علم رکھنے والے سے بڑھ کر علم رکھنے والے۔ اس دوسرے جملہ میں مبتدا نہیں مذکور ہے جس کی وجہ سے مفسروں نے مختلف معانی نکالنے کی کوشش کی ہے۔ صحیح مفہوم کیا ہے؟

ج۔ صحیح مفہوم یہ ہے کہ ہم سب علم والوں سے بڑھ کر علم رکھتے ہیں۔ یعنی نرفع میں جو ضمیر جمع متکلم کی ہے وہی دوسرے جملہ میں بھی مبتدا ہے نَحْنُ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاءُ وَنَحْنُ فَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ اس کی تشریح دوسری آیت سے ہوتی ہے نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاءُ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ (انعام ۱۰) ہم جس کے چاہتے ہیں درجے بلند کر دیتے ہیں۔ بے شک تیرا رب حکیم اور علیم ہے

س ۱۰۔ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ یعقوب کی دونوں آنکھیں غم سے سفید ہو گئیں۔ غم سے آنکھوں کا سفید ہو جانا غیر معمولی ہے۔ کہیں سننے میں نہیں آیا۔

ج۔ غم سے مراد ہے گریۂ غم۔ جس کی کثرت سے آنکھوں کا سفید ہو جانا غیر معمولی نہیں ہے۔

س ۱۱ ۔ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا اور سب اس کے سجدے میں گر گئے۔ اس کی تفسیریں اتنی مختلف کی گئیں ہیں کہ حقیقت ان میں گم ہو گئی ہے۔

ج ۔ اس کی تین تاویلیں بیان کی گئی ہیں۔ پہلی یہ کہ خَرُّوْا کے معنے جھک گئے۔ گر نہیں پڑے۔ لیکن یہ تاویل بے معنی ہے۔ بے شک خَرَّ کے معنی قرآن میں جھکنے کے آئے ہیں خَرَّ رَاكِعًا (ص ع ۲) داؤد جھک گئے رکوع میں۔ یہاں معنی ہوں گے کہ جھک گئے سجدہ میں پھر سجدہ اور کس کو کہتے ہیں۔ دوسری تاویل یہ کی گئی ہے کہ لَہٗ کی ضمیر کا مرجع اللہ ہے۔ یعنی وہ لوگ اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے گر گئے۔ یہ قرآن کے بالکل منافی ہے۔ اس لئے کہ حضرت یوسفؑ نے خواب میں سورج چاند اور ستاروں کو اپنے لئے سجدہ کرتے دیکھا تھا۔ اور ان لوگوں کے سجدہ کرنے پر فرمایا یَآ اَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا۔ ابا جان! یہ تعبیر ہے اس خواب کی جو میں نے دیکھا تھا میرے رب نے اس کو سچ کر دکھایا۔ اس سے واضح ہو گیا کہ حضرت یوسفؑ ہی کے سجدہ میں گرے تھے۔ نہ کہ اللہ کے۔ تیسری تاویل عام مفسرین نے یہ کی ہے کہ یہ سجدہ تعظیمی تھا۔ جو پہلی شریعتوں میں جائز تھا۔ لیکن یہ دونوں باتیں تسلیم کے قابل نہیں۔ پہلی شریعتوں میں بھی جو انبیاء پر نازل ہوئیں اسی توحید کی تعلیم تھی جو قرآن میں ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۔ (انبیاء ع ۲) اور تجھ سے پہلے ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر کہ ہم اس کی طرف وحی بھیجتے رہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ تم مجھ ہی کو پوجو۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ بندگی یا تعظیم کسی لحاظ سے بھی غیر اللہ کو سجدہ کرنا کسی سابقہ شریعت میں جائز رکھا گیا ہو۔ پھر یہ سجدہ تعظیمی ہو کیسے سکتا ہے۔ حضرت یعقوبؑ یوسفؑ کے باپ تھے ان کا حق ابوت اور حق تربیت یوسفؑ پر قائم تھا۔ نبوت کے لحاظ سے بھی ان کا

درجہ یوسفؑ سے بلند ثابت کیا جاسکتا ہے۔ پھر اگر سجدۂ تعظیمی کوئی شئے ہے تو یوسفؑ کو کرنا چاہیئے اپنے باپ کو نہ کہ یعقوبؑ کریں اپنے بیٹے کو۔
بعضوں نے ایک چوتھی تاویل بھی کی ہے کہ یہ سجدہ مصری دستور کے مطابق تھا یہ بالکل بے ثبوت ہے۔ علاوہ بریں یہ مجلس جس میں حضرت یوسفؑ نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا تھا اور ان کے سب بھائی حاضر تھے۔ خانگی مجلس تھی جس میں مصری آداب کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ لہذا یہ تاویل بھی بے حقیقت ہے۔
دراصل اس سجدہ کی علت محبت کے جذبہ کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ حضرت یعقوب فرط محبت سے بیٹے کی طرف گر گئے اور سب گھر والوں نے ساتھ دیا اور یہ محض ایک غیر اختیاری چیز تھی۔

س۱۱۔ وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ اللہ نے مجھ پر احسان کیا جبکہ مجھ کو قید خانہ سے نکالا۔ قید سے نکالنے پر اللہ کا شکر کیا۔ کیوں کنویں سے نکالنے کا ذکر نہیں کیا۔

ج۔ کیونکہ جن بھائیوں نے کنویں میں ڈالا تھا وہ سامنے موجود تھے اور حضرت یوسفؑ ان کے قصور کو معاف کر چکے تھے۔ اس لئے اس کے ذکر کو مناسب خیال نہ فرمایا۔

س۱۲۔ حَتّٰی اِذَا اسْتَایْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا اَنَّھُمْ قَدْ کُذِبُوْا یہاں تک کہ جب رسول مایوس ہو گئے اور ان کو خیال ہونے لگا کہ ان سے جھوٹا وعدہ کیا گیا ہے۔ کیا پیغمبر اللہ کے وعدہ کی نسبت جھوٹے ہونے کا گمان کرسکتے ہیں؟

ج۔ بعض وعدہائے الٰہی کی مدت معین ہوتی ہے جیسے ناقۂ صالح کے پاؤں کاٹنے کے بعد منکروں کے لئے تین دن کی مدت معین کی گئی تھی۔ ایسے وعدوں کی نسبت بدگمانی نہیں ہوسکتی۔ مگر جس وعدہ کی مدت معین نہ ہو اور اس کے پورا

ہونے میں اتنی دیر لگے کہ دلوں میں مایوسی پیدا ہو جائے اس وقت اس کی نسبت پیغمبر کے دل میں بدگمانی ہو سکتی ہے کیوں کہ وہ بھی بشر ہے۔ قرآن میں ہے حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ (بقرہ ع ۲۶) یہاں تک کہ کہنے لگے رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے کہ کب اللہ کی مدد آئے گی۔

سُورۂ رَعْد

س ۶ - یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْکِتٰبِ اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے اس کے پاس اصل کتاب ہے کیا مقدرات لکھ کر تقدیر کا قلم خشک نہیں ہو چکا ہے؟ جیسا کہ لوگوں میں مشہور ہے۔

ج - مشہور تو بہت سی باتیں ہیں۔ تقدیر کی کتاب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جب وہ خود کہتا ہے کہ اس میں محو و اثبات کرتا رہتا ہوں۔ تو کون ہے جو اس کے قلم کو خشک کہہ سکے۔ تقدیر الٰہی میں قیاسات اور مباحث انسانوں کی محدود عقلوں کے کھیل ہیں ۲ دوسری آیت میں ہے وَمَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ (فاطر) کسی بڑی عمر والے کو جو عمر دی جاتی ہے اور جو اس کی عمر گھٹائی جاتی ہے سب کتاب میں ہے۔

سورۂ ابراہیم

سؔ۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ جو رسول ہم نے بھیجا اسی کی قوم کی زبان کے ساتھ بھیجا۔ یہ بات پہلے رسولوں کے متعلق مناسب تھی جو ایک ہی قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے۔ مگر خاتم النبیین تو جملہ اقوام عالم کی طرف رسول بنا بنا کر بھیجے گئے۔ ان کو صرف عربی زبان میں کیوں پیغام ملا۔

ج۔ آیت میں قوم کا لفظ ہے نہ کہ اُمت کا۔ خاتم النبیین کی امت ساری قومیں ہوسکتی ہیں مگر آپ کی قوم تو صرف عرب ہے۔ اس لئے عربی زبان کتاب ملی۔

سؔ۔ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ اے میرے رب ان بتوں نے بہت سے انسانوں کو گمراہ کیا ہے۔ بُت کس طرح گمراہ کرتے ہیں؟

ج۔ مجازاً اُن کی طرف نسبت کی گئی ہے۔ یعنی ان بتوں کے پیچھے بہت لوگ گمراہ ہوئے قرآن میں ہے وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا (انعام [۱۷]) ان کو دنیا وی زندگی نے دھوکا دیا۔ یعنی دنیاوی زندگی کے پیچھے وہ دھوکے میں پڑے۔

سورہ حجر

س - إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ہم نے اتارا ہے الذکر کو اور ہم ضرور اس کی حفاظت کریں گے۔ یہاں الذکر سے قرآن مراد لینے کی کیا دلیل ہے؟

ج۔ قرآن کی بہت سی آیتیں اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں سب سے مفصل آیت یہ ہے إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ۔ (حم السجدہ ۵) جن لوگوں نے الذکر کا اس کے آجانے کے بعد انکار کیا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ عزت والی کتاب ہے جس میں جھوٹ کا دخل نہ آگے سے ہے نہ پیچھے سے آتاری ہوئی ہے حکیم کی جو سزاوار حمد ہے۔ اللہ نے قرآن کے ایک ایک لفظ کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے اُتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ (کہف ۲۷) تیرے رب کی جو کتاب تیرے اوپر وحی کی گئی ہے اس کی تلاوت کر۔ کوئی اس کے الفاظ کو بدلنے والا نہیں ہے۔

س۲۔ وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ ہم زندہ کرتے ہیں اور ہم موت دیتے ہیں اور ہم ہی وارث ہیں۔ وراثت کسی غیر کی ملکیت سے ملتی ہے اور اللہ تو ہمیشہ سے مالک ہے۔

ج۔ وارث کا اطلاق باقی رہنے والے پر بھی ہوتا ہے۔ یعنی سب فنا ہو جائیں گے اور ہم ہی باقی رہیں گے۔

س۳۔ قَدَّرْنَا إِنَّهَا لَمِنَ الْغَابِرِينَ۔ فرشتوں نے کہا ہم نے طے کر لیا ہے کہ لوط کی

بیوی ہلاک ہونے والوں میں سے ہے۔ تقدیر الٰہی کو فرشتوں نے اپنی طرف کیسے منسوب کیا۔

ج۔ عالم ملکوت کے کارکن روح ہوں یا فرشتے جو کام کرتے ہیں اللہ کی مشیت اور اس کے حکم سے کرتے ہیں یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (نحل ع) اُوپر سے اپنے رب کا ڈر رکھتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جو حکم پاتے ہیں۔ اس وجہ سے اللہ کے افعال کبھی اللہ کی طرف کبھی ان کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔ سورۂ مریم کے دوسرے رکوع میں ہے قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا۔ روح نے کہا کہ میں فرستادہ ہوں تیرے رب کا تجھے ایک پاکیزہ فرزند دوں۔ حضرت ابراہیمؑ کو اسحاق کی بشارت کہیں اپنی طرف منسوب فرمائی ہے کہیں فرشتوں کی طرف۔

س۔ فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ قسم ہے تیرے رب کی ہم ان سب سے سوال کریں گے ان کے اعمال کی بابت۔ اور سورہ الرحمان میں ہے فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَانٌّ اس دن کسی جن وانس سے اس کے گناہ کی بابت سوال نہ کیا جائے گا۔

ج۔ کئی بار کہا جا چکا ہے کہ قیامت میں حالات اور مقامات مختلف ہوں گے کہیں پوچھا جائے گا اور کہیں نہیں پوچھا جائے گا۔ اس کی کیفیت وہیں چل کر معلوم ہوگی قصہ زمین برسر زمین۔ جو کچھ اللہ نے فرمایا اس پر ایمان ہے۔

س۔ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۝ عبادت کر اپنے رب کی تاکہ تجھے یقین آجائے۔ یہاں یقین کے معنی مفسروں نے موت لکھے ہیں۔ یعنی مرتے دم تک عبادت کرو۔

ج۔ دراصل یہاں عبادت کی اہمیت ظاہر کی گئی ہے کہ اس سے انسان کو یقین حاصل

ہو جاتا ہے۔ مفسروں نے کوئی دلیل نہیں لکھی جس کی بنیاد پر یقین کے حقیقی معنی سے عدول کیا جائے۔ سورہ مدثر کی آیت وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ حَتّٰٓى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ۝ ہم آخرت کا انکار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم کو یقین آیا۔ میں بھی یقین اپنے حقیقی معنی میں ہے۔ کیونکہ مکذّبین کا یہ قول آخرت کو دیکھ لینے بلکہ جہنّم میں پہنچ جانے کے بعد کا ہے۔

سُورۃ نحل

س۔ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا گھوڑے اور خچر اور گدھے کہ تم ان پر سواری کرو۔ اُن کی تخلیق کی غرض سواری بیان کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کھانا حلال نہیں۔

ج۔ سواری بڑی غرض ہے۔ لیکن اسی پر انحصار نہیں ہے ورنہ ان سے کھیتی کا کام لینا یا ان پر بوجھ لاد کر لے جانا بھی حرام ہوگا۔

س۔ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اللہ وہ چیزیں پیدا کرے گا جن کو تم نہیں جانتے ہو۔ جو چیزیں ان کے علم میں بھی نہ تھیں ان کو اپنے انعامات میں کس مصلحت سے گنایا۔

ج ۔ سواری اور نقل و حمل کے لئے آئندہ جو سامان پیدا ہونے والے تھے مثلاً ریل موٹر، دخانی جہاز اور طیارے وغیرہ۔ اس وقت ان کی سمجھ میں نہیں آسکتے تھے اس لئے ان کی طرف صرف اشارہ فرمادیا۔ لیکن کیا امت انہی لوگوں پر محدود تھی اس کا سلسلہ تو قیامت تک جاری رہے گا۔ اور ان انعامات پر آنیوالی نسلیں شکر گذار رہیں گی۔

س۲۔ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ
اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاۤءٍ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ٥ اللہ
کے سوا جن کو مشرکین پکارتے ہیں وہ کچھ نہیں پیدا کرتے بلکہ خود پیدا کئے جاتے
ہیں۔ مردہ ہیں زندہ نہیں ہیں اور ان کو یہ بھی خبر نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے
یہاں اموات کے بعد غیر احیاء کہنے کی کیا ضرورت ہوئی؟۔
ج۔ مزید توضیح کے لئے۔ جیسے سورۂ بقرع۱۹ میں ہے وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاۤءٌ جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں
جس زور کے ساتھ شہیدوں کو زندہ کہا ہے اور مردہ ہونے کی ان سے نفی کی
ہے۔ اسی زور کے ساتھ ان انسانوں کو جن لوگوں نے معبود بنا رکھا ہے یا جن کی
قبروں کو پوجتے ہیں مردہ کہا ہے اور زندہ ہونے کی نفی ہے۔ نیز علم وشعور کی
بھی یہاں تک کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔
س۵۔ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ٥ ہم جب
کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو اس سے ہمارا کہنا یہی ہوتا ہے کہ ہوجا سو وہ ہو
جاتی ہے۔ کیا معدوم کے اوپر بھی شئے کا اطلاق ہوسکتا ہے۔
ج۔ کیوں نہیں قرآن میں ہے اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِيْمٌ (حج ۱) قیامت کا زلزلہ بہت
بڑی چیز ہے۔ حالانکہ ابھی اس کا وجود کہاں ہے۔ علاوہ بریں ہونے والی کوئی
چیز اللہ کے نزدیک معدوم نہیں ہے کیونکہ وہ اس کے علم میں ہے۔
س۸۔ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ اگر
اللہ انسانوں کے ظلم پر ان کی گرفت کرے تو زمین پر ایک جاندار کو بھی نہ چھوڑے
جانداروں نے کیا قصور کیا ہے؟
ج۔ کبھی کبھی عذاب عام بھی ہوتے ہیں جن کی لپیٹ میں بے گناہ آجاتے ہیں۔

طوفان نوح کی موجوں میں منکروں کے ساتھ ان کے مویشی بھی بہہ گئے تھے۔ سورۂ انفال ع۳ میں ہے وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً ڈرو اس عذاب سے جو صرف انہیں لوگوں پر تم میں سے نہیں آئے گا۔ جنہوں نے ظلم کیا ہے یعنی عام ہوگا۔

س۱۱۔ وَمَا أَمْرُ السَّاعَةِ إِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ أَوْ هُوَ أَقْرَبُ قیامت کا معاملہ بس نظر کا ایک لمحہ ہے یا اس سے بھی قریب تر۔ او کا حرف شک کیلئے ہے اور اللہ شک سے بری ہے۔

ج۔ اَوْ کا حرف کبھی بل کے معنی میں بھی آتا ہے كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً (بقرہ ع۹) تمہارے دل پتھر کی طرح ہیں بلکہ سختی میں اس سے بھی بڑھ کر۔

س۱۱۔ سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ پیراہن جو تم کو گرمی سے بچاتے ہیں۔ سردی سے بھی بچاتے ہیں اس کا ذکر کیوں نہ فرمایا۔

ج۔ ایک مقابل سے دوسرا سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس لئے اس کا ذکر ضروری نہیں ہوتا۔ آل عمران میں ہے بِيَدِكَ الْخَيْرُ شر کا ذکر نہیں۔

س۱۲۔ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ہم نے تیرے اوپر کتاب اتاری ہر شئی کی تشریح کرنے والی۔ جب تمام دینی امور کی تشریح اس کتاب میں کر دی گئی ہے تو پھر علماء اور فقہاء میں اس قدر بے شمار اختلافات کیوں واضح ہوئے۔

ج۔ علماء فقہاء بھی اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سوال انہیں سے کرنا چاہیئے۔

س۱۵۔ يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَن نَّفْسِهَا اس دن آئے گا ہر شخص اپنی طرف سے مدافعت کرتا ہوا۔ یہاں دونوں جگہ نفس کا لفظ بولا گیا ہے۔ کیا نفس کے بھی نفس ہے۔

ج۔ دونوں نفس کے معانی مختلف ہیں پہلے نفس کے معنی ہیں شخص کے اور دوسرے

سے مراد ہے واحد متکلم یعنی اپنی ذات۔

سٓ۱۵۔ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ اس بستی کو اللہ نے چکھا دیا بھوک کا لباس
چکھانے کے لئے عام طور پر مزا بولا جاتا ہے اور لباس تو پہنایا جاتا ہے۔

ج۔ اس طرز بیان سے یہ ظاہر کرنا مقصود کہ بھوک کی مصیبت اتنی عام کر دی گئی کہ ہر شخص پر چھا گئی اور اس طرح نمایاں ہو گئی جس طرح لباس۔ فن بلاغت میں اس کو تجرید الاستعارہ کہتے ہیں۔

سورۂ بنی اسرائیل

سٓ۱۔ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَى اللہ اپنے بندے کو راتوں رات لے گیا مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک۔ عبد ہر شے ہے اور یہاں عظمت کا مقصود ہے۔ اس لئے رسول یا نبی کا لفظ مناسب تھا پھر کیوں عبد لایا گیا؟

ج۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ مقامات میں جا بجا قرآن نے عبد ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سورۂ والنجم میں ہے فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى اور یہ اس لئے تاکہ قرآن پر ایمان رکھنے والے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عبد ہی مانیں۔ نصاریٰ کی طرح ان کو خدا نہ بنائیں۔

سٓ۱۔ بَارَكْنَا حَوْلَهٗ ہم نے اس کے ارد گرد برکتیں رکھی ہیں مسجد اقصیٰ مبارک مسجد ہے پھر فیہ ہونا چاہیئے حَوْلَهٗ کیوں کہا گیا؟

ج۔ مسجد اور وہ بھی انبیاء کی تعمیر کی ہوئی بذات خود برکت والی ہے۔ اور یہاں بیان

کرنا مقصود ہے اس کے اردگرد کی برکتوں کا۔ دینی برکتیں کہ وہ سرزمین بڑے بڑے انبیاء کا مستقر ہے اور دنیاوی برکتیں کہ اس میں باغات اور چشمے وغیرہ ہیں۔

س۲۔ وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَتَيْنِ ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا۔ حضرت مریم کے قصہ میں ہے وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعَالَمِينَ (انبیاء ۹۱) ہم نے مریم اور اس کے بیٹے کو دنیا والوں کے لئے ایک نشانی بنایا۔ نشانی ایک جگہ دو ہے اور ایک جگہ ایک۔

ج۔ رات اور دن دو الگ الگ نشانیاں ہیں اور حضرت مریمؑ سے عیسیٰؑ کی بن باپ کے ولادت کی وجہ سے دونوں کو مشترکہ ایک ہی نشانی قرار دیا۔

س۲۔ وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوشحالوں کو حکم دیتے ہیں۔ وہ اس میں فسق پھیلاتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ (اعراف ۲۸) اللہ بے حیائی کے کام کا حکم نہیں دیتا۔ ان دونوں میں تعارض کا وہم ہوتا ہے۔

ج۔ پہلی آیت میں امر سے مراد امر تکوینی ہے۔ یعنی ہم ان کو ایسا بنا دیتے ہیں کہ وہ فسق و فجور پر اتر آتے ہیں اور دوسری آیت میں امر تشریعی ہے۔

س۴۔ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا جس بات کا تجھے یقین نہ ہو اس کے پیچھے نہ چل سمع بصر اور قلب ہر ایک سے اس کی بابت بازپرس ہوگی۔ یقین کی شناخت نہیں بتائی گئی۔

ج۔ غالباً سمع، بصر اور قلب کی شہادت کا نام یقین ہے جو اس آیت میں مذکور ہے غیر یقینی بات کے پیچھے چلنا دنیاوی امور میں جہالت ہے اور دینی امور میں توہم پرستی

علم اور یقین کی توضیح سورۂ انعام گذر چکی ہے۔

س۲۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ جو دنیا چاہتا ہے تو ہم اس میں سے جو کچھ چاہتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں دیتے ہیں اور دوسرے مقامات پر ہے کہ جو دنیا چاہتا ہے اس کو دیدیتے ہیں مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا (شوریٰ ع۳) جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے ہم اس میں سے اس کو دیتے ہیں۔ ایک جگہ مطلق ہے کہ ہم ہر چاہنے والے کو دیتے ہیں اور ایک جگہ مقید کہ جس کو ہم چاہتے ہیں دیتے ہیں۔

ج۔ قرآن کے اصول کے مطابق جو قید کسی چیز کے ساتھ ایک جگہ لگائی جاتی ہے وہی ہر جگہ اس کے ساتھ رہتی ہے۔ بشرطیکہ کوئی قرینہ اس کے خلاف موجود نہ ہو۔ ایسی آیتیں جہاں جہاں بھی قرآن میں ہیں سب مشیت الٰہی کے ساتھ مقید ہو جائیں گی۔

س۲۔ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ٥ ہم نے ایک نبی کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور داؤد کو زبور عطا کی۔ کیا وجہ ہے کہ جملہ انبیا کا ذکر مجمل کیا گیا اور حضرت داؤد کا نام لے کر۔

ج۔ حضرت داؤد کی خصوصیت کی بڑی وجہ تو یہ ہے کہ وہ پہلے نبی ہیں جن کو بادشاہت بھی عطا ہوئی۔ علاوہ بریں زبور ان کو دی گئی کہ جب اس کو پڑھتے تھے تو دنیا وجد کرتی تھی۔ قرآن کہتا ہے يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ (سبا ع۲) اے پہاڑ اور پرندو اس کے ساتھ آواز ملاؤ۔

س۶۔ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ٥ ہم نے نشانیاں بھیجنی اس لئے بند کردیں کہ اگلوں نے ان کو جھٹلا دیا۔ لیکن ممکن ہے کہ پچھلے ان کو نہ جھٹلائیں۔

ج۔ مکہ والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رسالت کے ثبوت کے لئے ایسے

معجزے طلب کرتے تھے جو آنکھوں سے دیکھے جائیں جیسے حضرت موسیٰؑ یا عیسیٰ کو
کو ملے تھے لیکن اُن حسی معجزات کو دیکھ کر بھی اگلے لوگوں نے انکار کیا تھا اور ان
کو جادو اور نظر بندی قرار دیا تھا۔ بالاخر اتمام حجت کے بعد وہ ہلاک کر دیئے گئے۔
رحمۃ للعالمین کے عہد میں اس چشم دید معجزات کے سلسلۂ ابتلا کو اللہ نے بند کر دیا
کہ اب جو کوئی ایمان لائے وہ عقل و بصیرت سے ایمان لائے اسی لئے آپ کو عقلی
معجزہ قرآن دیا گیا جو ہمیشہ کے لئے قائم رہنے والا ہے۔ اس کا بیان سورہ انعام
میں گذر چکا ہے۔

س۔ اَلشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْاٰنِ وہ درخت جس پر قرآن میں لعنت کی گئی۔
قرآن میں تو کسی درخت پر لعنت نہیں ملتی۔

ج۔ ملعون کے معنی مکروہ یعنی بُرے کے بھی ہیں۔ قرآن میں زقّوم یعنی سینڈہ کے درخت
کا دو جگہ ذکر ہے اور بُرائی کے ساتھ ہے اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِيْمِ (الدخان)
سینڈہ کا درخت گنہگار کی خوراک اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ (والصافات)
سینڈہ ایک درخت ہے جو اُگتا ہے جہنم کی تلی میں۔

س ۱۲۔ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ
موسیٰ نے کہا فرعون سے کہ تو خوب جانتا ہے کہ یہ بصیرت کی چیزیں کسی نے
سوائے اللہ کے نہیں اتاری ہیں۔ مگر فرعون خوب جانتا تھا کہ حضرت موسیٰؑ
کے معجزات اللہ کی طرف سے ہیں تو ایمان کیوں نہ لایا۔ بعضوں نے اسی خیال
سے یہاں عَلِمْتَ واحد حاضر کو عَلِمْتُ واحد متکلم پڑھا ہے اور
اس قرأت کو حضرت علی کی طرف منسوب کیا ہے۔ یعنی موسیٰ نے کہا کہ میں خوب
جانتا ہوں۔

ج۔ شاذ قرأتیں خود قرآن کی تصریح کے مطابق نامعتبر ہیں جیسا کہ سورہ حج میں ہم

لکھیں گے۔ کسی کو سمجھ میں یہ بات نہیں آئی اس نے آیت میں تحریف کی اور اپنی سند کے لئے حضرت علی کا نام لے دیا۔ حالانکہ وہ قرآن کے ایک ایک لفظ کا علم رکھتے تھے۔ کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ قرآن میں ہے وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا (نمل ع۱) فرعون اور اس کی قوم نے موسیٰ کی نشانیوں کا ہٹ دھرمی اور سرکشی سے انکار کر دیا۔ حالانکہ ان کے دلوں کو یقین آچکا تھا۔

س۱۳۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ ۔ تعریف اللہ کے لئے ہے جس کے کوئی اولاد نہیں۔ نہ ملک میں کوئی اس کا شریک ہے نہ وہ کمزور ہے کہ کوئی اس کا مددگار ہو۔ بالعموم قرآن میں اللہ کی حمد نعمتوں پر کی گئی ہے۔ ان سلبی صفات میں کون سی نعمتیں ہیں؟

ج۔ بڑی نعمتیں ہیں۔ اس لئے کہ (نعوذ باللہ) اگر اللہ کے اولاد ہوتی یا شریک ہوتے یا مددگار تو اس کی ساری نعمتیں وہی سمیٹ لیتے۔ برائے نام جو کچھ بچتا ہم کو ملتا۔ اور ان کے نہ ہونے کی صورت میں سب کے حقدار ہم ہیں۔

سورۂ کہف

س۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا قَیِّمًا
اللہ کی تعریف جس نے اتاری اپنے بندہ پر کتاب اور نہ رکھی اس میں کوئی کجی
بالکل سیدھی۔ آخری دونوں فقرے ہم معنی ہیں۔ ایک کافی تھا کس ضرورت
سے دونوں لائے گئے۔

ج۔ قیّم کے معنی نگہبان کے بھی ہیں۔ یعنی اس کتاب میں کوئی کجی نہیں ہے اور گذشتہ
آسمانی کتابوں کی ابدی تعلیمات کی نگہبان ہے۔ سورہ مائدہ میں یہی مفہوم
مُھَیْمِن کے لفظ کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔

س۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ جو چاہے ایمان لائے اور جو
چاہے کافر ہے۔ اس سے کفر کی اباحت نکلتی ہے۔

ج۔ یہ اسلوب بیان کفر کی اباحت کے لئے نہیں۔ بلکہ شان بے نیازی کے اظہار
کے لئے ہے۔ کیونکہ اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ظالموں کے لئے ہم نے جہنم تیار
کر رکھا ہے۔

س۔ یُحَلَّوْنَ فِیْھَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَھَبٍ جنت میں اُن کو سونے
کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ یہ چیز تو دنیا میں مردوں کے لئے عیب شمار کی
جاتی ہے بلکہ جو لوگ ریشم اور حریر پہنتے ہیں وہ بھی اس کو استعمال نہیں کرتے۔

ج۔ جنت آیات متشابہات میں سے ہے۔ قرآن میں اس کے اکثر بیانات تشبیہی
اور تمثیلی ہیں۔ چونکہ ایران کے بادشاہ اور شاہزادے کنگن پہنتے تھے اور اس کو
شاہانہ آرائش اور دولت و امارت کی نشانی سمجھتے تھے۔ اس لئے اس کا ذکر

جنت کی نعمتوں میں بھی کیا گیا۔

س۵۔ وَحَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا ـــ ہم نے ان کو حشر میں جمع کیا اور ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑا۔ یہاں ماضی کے صیغے کیوں لائے گئے۔ حشر تو مستقبل میں ہوگا۔

ج۔ قرآن میں جنت دوزخ اور حشر وغیرہ کے بیانات میں عام طور پر ماضی ہی کے صیغے مستعمل ہوئے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ سب واقعات اللہ کے سامنے ہیں جو ماضی۔ حال اور مستقبل سب سے بری ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ آئندہ آنے والے واقعات مزعوم باتیں نہیں ہیں بلکہ موجود حقائق ہیں۔

س۶۔ نَسِيَا حُوتَهُمَا حضرت موسیٰ اور ان کے شاگرد دونوں اپنی مچھلی کو بھول گئے بھولے تھے صرف آن کے شاگرد پھر نسیان دونوں کی طرف کیوں منسوب کیا گیا۔

ج۔ بول چال کا یہ اسلوب عام ہے۔ ایک بھولا دوسرے نے خیال نہیں کیا اس وجہ سے وہ بھی اس کے ساتھ بھول میں شریک گردانا گیا۔

س۔ لیکن یہ کیسی بھول تھی کہ مچھلی جو ناشتہ کے لئے تیار کی گئی تھی زندہ ہو کر سمندر میں چل گئی اور یہ طرفہ ماجرا دیکھنے کے بعد بھی یوشع نے اس کو حضرت موسیٰ سے نہیں کہا۔

ج۔ بے شک کوئی شخص بھی ہوتا ایسی عجیب بات کو دیکھ کر چلا اٹھتا اور شور مچاتا۔ لیکن وہاں مشیت اپنا کام کر رہی تھی کہ یہ دونوں کچھ دیر کے لئے ہٹ جائیں تاکہ وہ صاحب علم لدنی یہاں آ کر متمکن ہو جائے اور واپسی پر ان کو مل جائے۔

س۱۰۔ يُرِيدُ أَنْ يَنْقَضَّ دیوار ارادہ کر رہی تھی کہ گرے۔ دیوار بے جان چیز ہے اور ارادہ تو جاندار میں ہوتا ہے۔

ج ۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ارادہ بے جان چیز میں نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ لفظ حقیقی معنی میں نہیں لیا جائے گا بلکہ لازمی معنی مراد ہوگا۔ یعنی قریب کیونکہ ارادہ قریب ہوتا ہے عمل کے۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ دیوار گرنے کے قریب تھی۔

س ۔ حضرت خضر نے حضرت موسیٰ کو کیوں پہلی اور دوسری بار ٹوکنے پر جدا نہیں کیا۔

ج ۔ پہلی بار حضرت موسیٰ نے بھول کا عذر کیا۔ دوسری بار کہا کہ اگر اب ایسا ہو تو جُدا کر دینا۔ تیسری بار کوئی عذر نہ تھا۔ اس لئے جُدا کر دیئے گئے۔

س ۔ حضرت خضر کو لوگوں نے ولی قرار دیا ہے کیونکہ ان کی نبوت کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ بعض صوفی حضرات نے تو اس سے یہ بھی نتیجہ نکال لیا کہ ولایت نبوت سے افضل ہے اگرچہ ہر نبی ولی بھی ہوتا ہے۔

ج ۔ نبوت اور ولایت کا ذکر تو الگ رہا حضرت خضر کا انسان ہی ثابت کرنا مشکل ہے قرآن سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فرشتے تھے قرآن نے ان کا جو قصہ بیان کیا ہے اس سارے قصہ میں صرف ایک اشارہ ان کی انسانیت کی طرف ہو سکتا ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ کے ساتھ گاؤں والوں سے ضیافت طلب کی۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ اپنے رفیق حضرت موسیٰ کے لئے جو کھانے کے ضرورت مند تھے طلب میں شرکت کی ہو۔ بخلاف اس کے ان کے فرشتہ ہونے کے اس قصہ میں دو اشارے پائے جاتے ہیں۔ پہلا یہ ہے جو انہوں نے فرمایا اَرَدْنَا اَنْ یُّبْدِلَہُمَا رَبُّہُمَا خَیْرًا مِّنْہُ ہم نے ارادہ کیا کہ ان کو ان کا پروردگار بدلہ میں اس سے اچھا بیٹا دے۔ اس ارادہ کو اپنی طرف منسوب کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عالم ملکوت کے کارکنوں میں سے تھے جو مشیت الٰہی کو کبھی اپنی طرف منسوب کر لیا کرتے ہیں جیسے حضرت لوطؑ سے فرشتوں نے کہا تھا کہ ہم نے طے کر لیا ہے کہ تیری بیوی ہلاک ہو گی۔ دوسرا یہ کہ آخر

میں انہوں نے فرمایا مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ میں نے اس کو اپنے حکم سے نہیں کیا ہے۔ یہی فرشتوں کی خصوصیت ہے وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (تحریم ۶) وہی کرتے ہیں جو حکم پاتے ہیں۔

سورۂ مریم

س۱۔ يَرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۔ جو میرا وارث ہو اور آل یعقوب کا۔ حضرت ذکریا نے اللہ سے دعا مانگی کہ مجھے بیٹا عطا کر جو میرا وارث بنے۔ کیا انبیاء کی وراثت ہوتی ہے؟ روایات میں تو بیان کیا گیا ہے کہ انبیاء کی وراثت نہیں ہوتی۔ وہ جو کچھ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے۔

ج۔ لیکن قرآن سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ یہاں حضرت زکریا نے جو نبی تھے اپنے لئے وارث کی دعا مانگی ہے اور سورہ نمل ۱۶ میں ہے وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ سلیمانؑ وارث ہوئے داؤد کے۔ یہ توجیہہ کہ سلیمانؑ کو حکمت اور نبوت اپنے باپ سے وراثت میں ملی صحیح نہیں کیونکہ یہ چیزیں وراثت میں نہیں ملتیں بلکہ وہبی ہیں اللہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے وہ سلطنت تھی جس کو انہوں نے حضرت داؤد سے وراثت میں پایا تھا۔ انبیاء علیہم السلام کے متروکہ کے صدقہ ہونے کا کوئی اشارہ قرآن میں نہیں ملتا۔

س۲۔ وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ـــــ تاکہ ہم عیسٰی کو لوگوں کے لئے اپنی نشانی اور رحمت بنا دیں۔ خاتم النبیین کو لوگ رحمۃ للعالمین کہتے ہیں اس بنا پر کہ قرآن میں ہے وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء ۱۰۷) ہم نے تجھ کو رسول بنایا

دنیا والوں پر رحمت کرکے اللہ نے خود حضرت عیسیٰ کو رحمت بنایا اور خاتم النبیینؐ کو دنیا والوں پر رحمت کرکے رسول بنایا۔ دونوں رحمتوں میں مفعول بہ اور مفعول لہ کا فرق ہے۔

ج۔ ہر رسول کی رسالت من جانب اللہ انسانوں پر رحمت ہی ہوتی ہے کیونکہ وہ مومنوں کے لئے نجات کا راستہ اور ہدایت لے کر آتے ہیں۔ اسی معنی میں حضرت عیسیٰ رحمت بنائے گئے تھے اور یہی غرض خاتم النبیینؐ کی رسالت سے بھی تھی۔ لہٰذا حقیقت کے لحاظ سے کوئی فرق دونوں رحمتوں میں نہیں ہے۔ خاتم النبیین کی رسالت چونکہ جملہ بنی نوع انسان کے لئے ہے اس لئے سارے عالم کے لئے رحمت ہے اور حضرت عیسیٰ کی رسالت بنی اسرائیل کے لئے تھی وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ (آل عمرانؑ) اس لئے صرف بنی اسرائیل کے لئے رحمت تھی۔

س۔ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا۔ ہم نے اپنی رحمت سے اس کو بخشا اس کے بھائی ہارون نبی کو۔ بیٹا یا بیٹی کے لئے بخشش کا لفظ بولا جاتا ہے مگر یہاں بھائی کے لئے مستعمل ہوا ہے۔

ج۔ حضرت موسیٰؑ نے دعا کی تھی کہ میری زبان نہیں چلتی۔ میری مدد کے لئے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے۔ اللہ نے ان کی دعا قبول فرما کر حضرت ہارون کو نبی بنایا۔ اسی کو بخشش سے تعبیر فرمایا ہے یعنی موسیٰ نے مانگا اور ہم نے عطا فرمایا۔

سورۂ طٰہٰ

سؑ۔ وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰؑ۔ اللہ کو علم تھا وہ دیکھ رہا تھا۔ پھر یہ سوال کس غرض سے کیا۔

ج۔ حضرت موسیٰ کی رسالت کی کامیابی میں اس عصا سے بہت کام لیا جانے والا تھا اس لئے اس کی بابت سلسلۂ کلام شروع کیا۔

س۔ حضرت موسیٰؑ نے اس ادب کے مقام پر مختصر جواب دینے کی بجائے کہ یہ میرا عصا ہے۔ کیا سوچ کر اس کے فائدے بھی گنا دیے۔

ج۔ اُن کا یہ جواب بتوفیق الٰہی تھا کہ عصا کے وہ فائدے جو ان کے علم میں ہیں بیان کریں تو ان کو اس کے اس عظیم الشان فائدہ کا علم دیا جائے جو اللہ نے اس میں رکھا ہے اور جس کو وہ نہیں جانتے یعنی اس کو اژدہا بنا کر دکھا دیا جو اُن کو فرعونیوں پر غلبہ اور بنی اسرائیل کو نجات دلانے کے لئے معجزہ کبریٰ تھا۔

سؑ۔ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيٰى جہنمی نہ اس میں مرے گا نہ جیئے گا اور دو حالتوں کے سوا تیسری حالت کون سی ہے۔

ج۔ یہ بلیغ جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ اس کو موت کا سکون نصیب ہوگا نہ زندگی کی لذت۔

سؑ۔ وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلٰى آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ۔ ہم آدم سے پہلے عہد لے چکے تھے۔ پھر اس نے بھلا دیا۔ آدم نے بھول کر شجر ممنوعہ کو کھایا تو اس پر سزا کا کیوں مستحق ہوا کہ جنت سے نکال دیا گیا۔ بھول چوک تو معاف ہے۔

ج۔ یہاں نَسِيَ کے معنیٰ اس کے بھول کے نہیں ہیں جو معاف ہے۔ شجر ممنوعہ کھانے

سے پہلے آدم اور ابلیس میں اچھی خاصی بحث رہی ہے جس کے آخر میں ابلیس نے کہا مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝ (اعراف ۲۰) اللہ نے تم دونوں کو اس درخت سے صرف اس لئے روکا ہے کہ کہیں تم فرشتے یا جاودانی نہ بن جاؤ۔ اس لئے نسی کا معنیٰ یہاں نافرمانی کے ہیں۔ جیسا کہ اس کے آگے ہے وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔ اس لئے راستہ سے بھٹک گیا۔

سورۂ انبیاء

س۔ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ لوگوں کے لئے ان کا حساب قریب آگیا اس آیت کو اترے ہوئے صدیاں گذر گئی ہیں مگر حساب کا وقت ابھی تک نہیں آیا۔

ج۔ یہ قرب اللہ کے نزدیک ہے اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا (معارج ۱) لوگ اس کو دور سمجھتے ہیں اور ہم اس کو قریب سمجھتے ہیں۔ قرآن کی متعدد آیات سے واضح ہوتا ہے کہ زمانہ کا امتداد محض خیالی ہے كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا (والنازعات) جس دن لوگ قیامت کو دیکھیں گے ان کو ایسا لگے گا کہ ایک شام یا ایک صبح سے زیادہ نہیں رہے۔

س۔ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اگر تم نہیں جانتے تو اہل کتاب سے پوچھ دیکھو۔ مگر مشرکین اہل کتاب کو کب مانتے تھے۔ ان کا قول تھا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ (سبا ۳۱) ہم ہرگز اس

قرآن پر ایمان نہیں لائیں گے نہ اس سے پہلی کتابوں پر۔ پھر وہ اہل کتاب سے کیوں سوال کریں گے۔

ج۔ مشرکین اُن کتابوں کو نہیں مانتے تھے مگر جانتے تھے کہ اہل کتاب آسمانی کتاب رکھنے کے دعویدار ہیں اور مسلمانوں کے مقابل میں اُن کی جانب داری بھی کرتے تھے اسی لئے کہا گیا کہ اُن سے پوچھو وہ رسولوں کی کیفیت تم سے بیان کریں گے۔

س۳۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے بنایا۔ ملائکہ اور جن کہاں پانی سے بنائے گئے ہیں۔

ج۔ یہاں اُن جانداروں کا بیان ہے جو زمین میں ہیں۔ اس کی تفسیر دوسری جگہ ہے وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّن مَّآءٍ (نور ۴۵) اللہ نے ہر جاندار کو جو زمین پر چلتا ہے پانی سے بنایا۔

س۴۔ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ۔ ہر ایک سورج اور چاند ایک ایک دائرہ میں گھوم رہے ہیں۔ قرآن کے ان الفاظ سے بعض لوگوں نے دلیل پکڑی ہے کہ ان کی گردش دَوری ہے۔

ج۔ ہاں یہ لطیفہ ہے نہ کہ دلیل۔ یعنی كُلٌّ فِي فَلَكٍ کو اُلٹ کر پڑھو تو یہی ہوتا ہے۔ اس سے حرکت دَوری نکالتے ہیں۔ ایسی ہی ایک صنعت تقلیب سورہ مدثر میں بھی ہے رَبَّكَ فَكَبِّرْ اپنے رب کی بڑائی کر۔ اس کو اُلٹ کر پڑھو تو وہی عبارت ہوتی ہے۔ اس سے بھی یہ لطیفہ نکالا جا سکتا ہے کہ تو رب کی بڑائی کر رب تجھ کو بڑا بنادے گا۔

س۵۔ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا۔ بلکہ اس بڑے بت نے کیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے بتوں کو خود توڑا تھا پھر یہ کیسے فرمایا کہ بڑے بُت نے توڑا ہے۔

ج۔ معارضہ کے طور پر بحث میں مشرکوں کو ساکت کرنے کے لئے۔ اسی لئے یہ شرط

بھی لگائی کہ اگر یہ بول سکتے ہوں تو ان سے پوچھو۔

س۔ وَحَرَامٌ عَلٰی قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۔ حرام ہے اس بستی پر جس کو ہم نے ہلاک کر دیا کہ واپس نہیں لوٹیں گے۔ واپس نہ لوٹنا حرام ہوا تو واپس لوٹنا واجب ہوا۔

ج۔ حرام کے معنی مقرر اور طے کر دینے کے ہیں پہلے بھی یہ لفظ آچکا ہے۔ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ (انعام) آؤ میں تم کو سناؤں جو تمہارے رب نے تم پر مقرر کیا ہے۔ اس کے نیچے دس احکام ہیں جن میں سے پانچ حرام ہیں اور پانچ واجب۔ اس لئے حرّم کے معنی سوائے مقرر کر دینے کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتے نہ یہاں نہ وہاں۔

س۔ اِذَا فُتِحَتْ يَاجُوْجُ وَمَاجُوْجُ جب کھول دیے جائیں گے یاجوج اور ماجوج الآیہ۔ ان کا یہاں ذکر آیا ہے اور سورۂ کہف میں بھی۔ کیا یہی دجّال تو نہیں جس کا ذکر روایات میں ہے۔

ج۔ قرآن کے بیان کے مطابق یاجوج اور ماجوج دو انسانی قومیں ہیں جن کا کام روئے زمین میں فساد اور غارت گری ہے۔ اور دجّال روایات میں ایک فرد دکھایا گیا ہے لہٰذا یاجوج وماجوج دجّال کیسے ہو سکتے ہیں۔ قرآن میں دجّال کا کوئی ذکر اشارۃً بھی نہیں ہے۔

س۔ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۔ جن کے لئے ہم نے پہلے بھلائی لکھ دی ہے وہ جہنّم سے دور کر دیئے جائیں گے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا (مریم ۵) اور تم میں سے کوئی نہیں جو جہنّم پر نہ اترے یہ تیرے رب کا قطعی فیصلہ ہے۔ دونوں میں بظاہر تعارض کا خیال ہوتا ہے۔

ج۔ جہنم پر سب کا وارد ہونا لازمی ہے۔اس کے بعد دور کر دیے جائیں گے جس کے لئے یہاں مُبْعَدُوْنَ ہ کا لفظ ہے اور سورۂ مریم میں ہے ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا پھر ہم متقیوں کو نکال دیں گے۔

س۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ہ ہم نے تجھ کو رسول بنایا رحمت کر کے سب جہان والوں پر۔ کیا خاتم النبیین کافروں کے لئے بھی رحمت تھے؟

ج۔ اس لحاظ سے کہ ہدایت عامہ لائے۔سب کے لئے رحمت ہیں۔لیکن اصلی رحمت انہیں لوگوں کے لئے ہیں جو ایمان لائے وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ (توبہ ۸) وہ رحمت ہیں تم لوگوں میں سے اُن کے حق میں جو ایمان لائے۔

سورۂ حج

س۔ یَوْمَ تَرَوْنَهَا جس دن تم قیامت کے زلزلہ کو دیکھو گے۔یہ جمع کا صیغہ ہے پھر اس کے آگے مفرد کا صیغہ کیوں ہے وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى تو دیکھے گا لوگوں کو مدہوش۔

ج۔ قیامت کا آغاز زلزلہ سے ہے جس کو سب دیکھیں گے۔اور لوگوں کو مدہوش تو وہی دیکھے گا جو خود ہوش میں ہوگا۔

س۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ اللہ اگر نہ ہٹایا کرتا لوگوں کو ایک دوسرے کے باہمی مقابلوں کے ذریعہ سے توڑھا دیے جاتے تکیئے، کنیسے، خانقاہیں اور مسجدیں

عیسائیوں کے کینسے اور یہود کی خانقاہیں بچانے کا فائدہ مسلمانوں کے لئے کیا ہے۔
ج۔ یہاں سنت الٰہی بیان کی گئی ہے کہ انسانوں میں باہمی لڑائیاں دنیا کی بہتری کے لئے مقدر ہوئی ہیں۔ دوسری جگہ ہے وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (سورۂ بقرہ ع ۳۳) اگر اللہ نہ ہٹاتا لوگوں کو ایک دوسرے کے باہمی مقابلہ کے ذریعہ سے تو دنیا بگڑ جاتی لیکن اللہ دنیا والوں پر احسان کرتا ہے۔

س۔ وَكُذِّبَ مُوْسٰى ۔ موسیٰ جھٹلائے گئے۔ اوپر جتنے رسول مذکور ہوئے ان کی بابت فرمایا کہ ان کی قوموں نے ان کو جھٹلایا۔ لیکن حضرت موسیٰؑ کے متعلق مجہول کا صیغہ لایا گیا۔ اس فرق کی کیا وجہ ہے۔
ج۔ دیگر انبیاء کی تکذیب خود ان کی قوموں نے کی تھی۔ مگر حضرت موسیٰ کو ان کی قوم نے نہیں بلکہ فرعونیوں نے جھٹلایا تھا۔

س۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۔ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۔ جو رسول یا نبی ہم نے تجھ سے پہلے بھیجا اس نے جب تلاوت کی شیطان نے اس کی تلاوت میں ملاوٹ کر دی۔ اللہ شیطان کی ملاوٹ کو نکال کر اپنی آیتوں کو پختہ کر دیتا ہے۔ یہاں تمنّٰے کے معنی عام طور پر مفسروں نے آرزو کرنے کے لکھے ہیں جس سے آیت کا مطلب خبط ہو جاتا ہے۔
ج۔ شیطان سے یہاں مراد ہیں کذابین جن کی تفصیل سورہ انعام میں ہم لکھ چکے ہیں یہ کذابین رسول یا نبی پر اُتری ہوئی آیتوں میں اپنی طرف سے الحاق یا اضافے کرکے ان کے معانی کو بدلنے کی کوشش کرتے تھے۔ اللہ نے اس کی ذمہ داری لی کہ ان کی بڑھائی ہوئی باتوں کو نکال کر ہم اپنی آیتوں کو مستحکم کر دیں گے۔

رسول کی آرزو میں یہ شیاطین کیا ملاوٹ کرسکتے اور پھر آرزو کی ملاوٹ دور کرنے سے تو آرزو ہی پاک ہوسکتی ہے۔ آیتیں کیسے پاک اور پختہ ہوں گی۔ اس لئے یہاں تمنّا کے معنی سوائے تلاوت کے اور کچھ نہیں ہوسکتے [1]

قرآن کریم کی آیات میں بھی کنایوں نے اپنے الفاظ ڈالنے کی کوششیں کیں۔ لیکن اللہ نے اپنی کتاب بلکہ اس کے ہر لفظ کو اپنی جگہ پر بین الدفتین ایسا محفوظ کردیا کہ سارے عالم میں بلا اختلاف ایک حرکت یا ایک نقطہ کے وہ پڑھا جاتا ہے [2]

---

[1] تمنّٰی کے لغوی معنے آرزو کے ہیں لیکن یہ تلاوت کے لئے بھی مستعمل ہے۔ علامہ بیضاوی نے سورہ بقرہ میں امانی کے معنے تلاوت کے لکھے ہیں اور سند میں حضرت حسان بن ثابت کا ایک شعر بھی نقل کیا ہے جو انہوں نے حضرت عثمان کے مرثیہ میں لکھا ہے۔

تمنّٰی کتاب اللہِ اول لیلہ ۔۔۔ وآخرہ لاقیٰ حمام القادر

آغاز شب میں انہوں نے کتاب اللہ کی تلاوت کی اور آخر شب میں اپنی تقدیری موت سے جا ملے۔

[2] یورپین مستشرقین نے مشہور جرمن مستشرق نولدکی کے زمانہ سے قرآن کے مقابلہ میں ایک محاذ قائم کر رکھا ہے۔ ان کی مسلسل کوشش یہی ہے کہ کسی صورت سے کوئی رخنہ اس میں پیدا کریں۔ اختلافات قرأت کی روایتیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں اور ان پر تاریخی بحثیں کرتے ہیں اس قسم کی روایتوں کا ایک مجموعہ کتاب المصاحف مؤلفہ حافظ ابوبکر عبداللہ سجستانی متوفی ۳۱۶ھ ان کو دستیاب ہوا۔ یہ حافظ ابوبکر صاحب سنن امام ابوداؤد کے بیٹے ہیں۔ اس کو ایک انگریز مستشرق ڈاکٹر آرتھر جیفری نے نہایت اہتمام کے ساتھ مع انگریزی ترجمہ و حواشی وغیرہ کے لیڈن سے ۱۹۳۷ء میں شائع کیا ہے تاکہ قرآن کے مقابلہ میں بطور آلۂ حرب استعمال کریں۔ اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے انسانوں کی ہدایت کے لئے قرآن کو اتارا اور پھر ہزار ہزار شکر کہ اس نے اس کی حفاظت کی خود ذمہ داری لے لی ورنہ دوسری آسمانی کتابوں کی طرح یہ بھی کبھی کا خود مسلمانوں کے ہاتھوں محرّف و مبدل ہوچکا ہوتا۔

س ۱۵۔ مِلَّۃَ اَبِیۡکُمۡ اِبۡرٰھِیۡمَ یہ دین ہے تمہارے باپ ابراہیمؑ کا۔ حضرت ابراہیم ساری امت کے باپ تو نہ تھے۔

ج۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے باپ تو تھے جو امت کے رسول اور باپ سے بھی بڑھ کر ہیں اور ان کی ازواج مطہرات امہات المومنین ہیں۔

س ۱۶۔ ھُوَ سَمّٰکُمُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ مِنۡ قَبۡلُ وَفِیۡ ھٰذَا۔ اس نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔ پہلے سے بھی اور اس قرآن میں بھی۔ بہت سے مفسروں نے ھُوَ کی ضمیر کا مرجع حضرت ابراہیم کو قرار دیا ہے۔

ج۔ اس آیت سے پہلے ہے ھُوَ اجۡتَبٰکُمۡ اللہ نے تم کو منتخب فرمایا۔ اس لئے عربیت کے اصول کے مطابق دوسرے ھُوَ کا مرجع بھی اللہ ہی ہے۔

س۔ بعض مسلم جماعتیں اپنے آپ کو مسلم کے بجائے مومن کہتی ہیں۔

ج۔ مسلم اور مومن میں ظاہر اور باطن کا فرق ہے۔ قرآن میں ہے قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَلٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَلَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ (حجرات ع۲) بدوؤں نے کہا ہم ایمان لائے۔ اُن سے کہدو کہ تم ایمان نہیں لائے ہاں یہ کہو کہ ہم اسلام لائے۔ ایمان تو تمہارے دلوں میں ابھی داخل نہیں ہوا ہے اس لئے جو شخص اپنے کو مومن کہتا ہے وہ دعویٰ کرتا ہے کہ ایمان اس کے دل میں داخل ہو چکا ہے اور یہ اپنی پاکیزگی جتاتا ہے جس کو قرآن نے منع فرمایا ہے فَلَا تُزَکُّوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ (النجم ع۲) اپنے نفس کی پاکیزگی نہ جتاؤ۔ بخلاف اس کے مسلم کا اطلاق ظاہری اعمال پر ہوتا ہے جن کو سب دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح دیگر مذہبی امتیازات جو اپنے ناموں کے ساتھ لوگ لگاتے ہیں۔ وہ بھی جائز نہ ہوں گے کیونکہ اس سے ملت کی وحدت کا شیرازہ ٹوٹتا ہے۔

سورۂ مومنون

س۱ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝ پھر تم اس کے بعد ضرور مرو گے۔ پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے کیا قبر میں زندہ کر کے سوال وجواب نہیں ہو گا۔

ج۔ ہوتا تو اس کا ذکر ہوتا۔ سارے قرآن میں کہیں قبر کی زندگی اور برزخ کے عذاب و ثواب کا ذکر نہیں ہے جن لوگوں نے آیات سے اس کو نکالنے کی کوشش کی ہے۔ محض روایات کی حمایت کی ہے اور کچھ نہیں۔

س۲۔ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ اے میرے رب مجھے واپس کر دیجئے۔ مخاطب واحد ہے اور صیغہ جمع کا ہے۔

ج۔ گنہگار مرنے والے پر موت کے وقت جو مصیبت اور پریشانی ہوتی ہے اس کو دکھلانے کے لئے۔ کہ وہ مخاطب کرتا ہے اپنے رب کو اور کہنے لگتا ہے موت کے فرشتوں سے۔

س۳۔ فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ جب صور پھونک دیا جائے گا اس دن ان میں باہم کسی قسم کا رشتہ نہ ہو گا اور نہ ایک دوسرے سے سوال وجواب کریں گے اور سورہ طور ع۱ میں ہے وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ وہ ایکدوسرے کی طرف رُخ کر کے آپس میں پوچھ گچھ کریں گے۔

ج۔ صور پھونکا جائے گا قیامت کیوقت۔ اور سورہ طور میں جن کا ذکر ہے وہ جنت میں پہنچ چکے ہیں۔ غرض حشر میں مقامات مختلف ہیں اور حالات بھی مختلف ہیں۔ ان میں باہم تعارض نہیں ہے۔

سورۂ نور

س۔ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ہے جیسے طاق میں چراغ۔ چراغ شیشے میں۔ شیشہ گویا سپید تارا تیل جلتا ہے اس میں زیتون کے مبارک درخت کا جو نہ مشرقی ہے نہ مغربی۔ جس کا تیل سبے لو لگائے چمک دے رہا ہے۔ روشنی پر روشنی۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے نور کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ اللہ لوگوں کے لئے مثال بیان کرتا ہے[1] اس کو ہر شئے کا علم ہے (طاق) اُن گھروں (مسجدوں) میں جن کو بلند کرنے کی اللہ نے اجازت دی ہے اور جن میں اس کا نام لیا جاتا ہے۔ یہاں بعض مفسروںؒ نے نور کا معنی یعنی روشن گر قرار دیا ہے۔

ج۔ جن لوگوں نے نور کے معنی منوّر کے لئے ہیں اُن کو غلط فہمی یہ ہوئی کہ انھوں نے نور سے وہ روشنی سمجھی جو زمین و آسمان میں آنکھوں کو نظر آتی ہے اور وہ نور قرآن میں مخلوق کہا گیا ہے وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ (انعام) اللہ نے بنایا تاریکیوں اور روشنی کو۔ اس لئے مجبوراً اُن کو نور کا مفہوم منور قرار دینا پڑا حالانکہ یہاں نور حقیقت مراد ہے۔

س۔ نور کی مثال سورج سے کیوں نہ دی گئی وہ تو چراغ سے بہت زیادہ روشن ہے۔

---

[1] اس مثال کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ مسجد سے مراد ہے دین۔ طاق سے مومن۔ شیشہ سے اس کا آئینہ دل۔ چراغ سے ایمان اور مبارک زیتون کے تیل سے وہ ہدایت جو کلام الٰہی سے حاصل ہوتی ہے جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔

ج۔ گھر میں طاق، طاق میں شیشہ اور شیشہ میں چراغ۔ یہاں سورج کی کہاں گنجائش پھر یہ نور توفیق الٰہی۔ بندے کے ایمان اور عمل صالح سے ملتا ہے۔ جس طرح چراغ کی روشنی آگ کی لو۔ تیل اور بتی سے حاصل ہوتی ہے اس لئے دونوں میں مماثلت زیادہ ہے۔

سورہ فرقان

س۔ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا لِّنُحْيِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا۔ ہم نے بادل سے پاک پانی برسایا کہ اس سے مردہ زمین کو زندہ کریں۔ یہاں بلدۃً مونث ہے۔ اس کی صفت میتاً کو بھی قاعدہ سے مونث ہونا چاہیئے۔

ج۔ اصول لسانی یعنی صرف و نحو وغیرہ کے قاعدے علمائے ادب نے بیشتر قرآن ہی سے اخذ کر کے بنائے ہیں لہٰذا وہ قواعد قرآن کی عبارت پر حاکم نہیں ہو سکتے۔ قرآن میں ایسی مثالیں متعدد ہیں۔ اسی سورہ کے آخر میں ہے وَجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا نحو کا تقاضا ہے کہ امام کی جگہ ائمہ ہو۔ سورہ طٰہٰ کے پہلے رکوع میں ہے وَلِیَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى مآرب موصوف جمع ہے اور آخری اس کی صفت مفرد۔ سورہ نساء کے رکوع ۲۲ میں ہے وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ قاعدہ یہاں المقیمون کا مقتضی ہے وغیرہ وغیرہ ان سب کا جواب یہ ہے کہ جو قواعد مرتب کئے گئے وہ اس قدر کلی نہیں ہیں کہ ان سے کوئی مستثنٰی نہ ہو۔

س۔ مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ جس

نے توبہ کر لی اور ایمان لایا اور نیک کام کئے اللہ اس کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دیتا ہے سورۂ ہود کے دسویں رکوع میں ہے اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہاں ہے ان کی برائیاں بھلائیو سے بدل جاتی ہیں دونوں میں فرق ہے۔

ج۔ سورہ ہود میں صرف عمل صالح کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے اور یہاں ایمان اور عمل صالح دونوں کا۔

سورۂ شعراء

س۔ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہنا کہ ہم اللہ کے رسول ہیں سورہ طٰہٰ کے دوسرے رکوع میں ہے فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ کیوں ایک جگہ رسول کا لفظ مفرد ہے اور ایک جگہ تثنیہ اور حکایت دونوں جگہ ایک ہی ہے۔

ج۔ حضرت موسیٰ اور ہارون تعداد کے لحاظ سے دو تھے اور رسالت کے لحاظ سے ایک اس لئے مفرد اور تثنیہ دونوں ضمیریں ان کے لئے لائی جا سکتی ہیں۔

س۔ بجز ان شاعروں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کئے تمام شاعر جھوٹے قرار دیئے گئے۔ مگر ان کے لئے کوئی سزا نہیں مقرر کی گئی۔

ج۔ سزا جرم پر ہوتی ہے۔ نفس شاعری خواہ نظم میں ہو یا نثر میں جرم نہیں ہے گناہ ہے۔ اس لئے جب تک جرم کی حد تک نہ پہنچے دنیاوی سزا نہیں دی جائے گی آخرت میں جو انجام ہوگا وہ بتا دیا ہے کہ جلد ان کو معلوم ہو جائے گا کہ کس کروٹ گرتے ہیں۔

سُورۂ نمل

سؔ۔ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ برکت والا ہے جو آگ میں ہے۔ یہ آگ کیسی تھی اور آگ میں کون تھا۔

ج۔ حضرت موسیٰؑ کو آگ نظر پڑی تھی اور اسی کے لینے کو چلے تھے۔ اس لئے آواز دینے والے نے وہی لفظ کہا۔ ورنہ وہ تو نورانی جلوہ تھا۔

سؔ۔ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ اللہ نے فرمایا میرے پاس رسول نہیں ڈرتے مگر وہ جنہوں نے گناہ کیا۔ کیا رسول بھی گناہ کرتے ہیں؟

ج۔ کیوں نہیں بعض بعض رسولوں سے ایسی باتیں ہوئیں جن پر ان کو عتاب کیا گیا۔ ان سے خفیف سی بھی غلطی ہوجاتی ہے تو بہت زیادہ ڈرتے ہیں۔

سؔ۔ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ہم کو طیر کی بولی سکھائی گئی اور ہم کو ہر چیز دی گئی۔ حضرت سلیمانؑ نبی تھے مگر ان کا یہ کلام تو شاہانہ انداز کا ہے۔

ج۔ یہ جمع کا صیغہ عظمت کے اظہار کے لئے انہوں نے استعمال نہیں کیا بلکہ اس سے مراد ہے اپنی اور باپ کی ذات۔

س۔ خط میں حضرت سلیمانؑ نے پہلے اپنا نام اس کے بعد اللہ کا نام لکھا۔ اس کی مصلحت کسی نے بیان نہیں کی۔

ج۔ ان کو معلوم تھا کہ بلقیس اور اس کے امراء نہ اللہ کو جانتے ہیں نہ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس لئے اس سے نہیں ڈریں گے مگر میرے نام اور میری قوت سے واقف ہیں۔ لہذا ڈر کر حاضر ہوجائیں گے۔

سؔ۔ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ جو لوگ

آسمان اور زمین میں ہیں وہ غیب نہیں جانتے۔ بجز اللہ کے ہم کو تو جنت دوزخ حشر نشر وغیرہ کا علم ہے۔

ج۔ ان کے متعلق ہم اسی قدر جانتے ہیں جس قدر ہم کو بتایا گیا ہے۔ اس پر غیب کی تعریف صادق نہیں آتی۔

سؔ۔ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دَاخِرِيْنَ قیامت کے دن سب اللہ کے سامنے آئیں گے عاجزی کے ساتھ۔ نبی اور صدیق وغیرہ تو اس دن بھی معزز اور مکرم ہوں گے۔

ج۔ یہاں مراد ہے عجز بندگی جس سے کسی کی عزت کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی ہے۔

سورہ قصص

سؔ۔ وَاَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّ مُوْسٰى اَنْ اَرْضِعِيْهِ موسیٰ کی ماں کو ہم نے وحی کی کہ اس کو دودھ پلا۔ بلا وحی کے بھی وہ دودھ پلاتیں۔ کیونکہ ماں تھیں جس کا فطری وظیفہ یہ ہے کہ اپنے بچہ کو دودھ پلائے۔

ج۔ مقصود اس وحی سے دراصل اس کے بعد کا جملہ ہے۔ یعنی جب تجھے اس بچہ کے قتل کا خوف ہو تو اس کو سمندر میں ڈال دے اور اس کے ڈوبنے کا خوف نہ کر اور جب تک یہ وقت نہ آئے اپنا مادری فریضہ دودھ پلانے کا ادا کرتی رہ۔

سؔ۔ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ۔ حضرت موسیٰ نے قبطی کو مار ڈالنے کے بعد کہا یہ شیطان کا کام ہے۔ مگر شیطان کو اللہ کے نیک بندوں پر تسلط نہیں ہے اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (نحل ع ۱۳) شیطان کا کوئی زور ان لوگوں پر نہیں ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر

بھروسہ رکھتے ہیں۔ ان آیتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔

ج۔ سورہ نحل کی آیت کا مطلب یہ ہے کہ شیطان کا کوئی تسلط مومنوں پر نہیں رہ سکتا۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طَآئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (اعراف ۲۴) جو متقی ہیں ان پر جہاں شیطان پھیرا ہوا چونک پڑے اور ان کی آنکھیں کھل گئیں۔

س ۳۔ اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْكَ لِیَجْزِیَكَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا میرے ابا تم کو بلا رہے ہیں کہ ہمارے کو جو تم نے پانی پلایا ہے اس کی مزدوری تم کو دیں۔ حضرت موسیٰ نے یہ کام مزدوری کے لئے نہیں کیا تھا پھر کیوں گئے۔

ج۔ حضرت موسیٰ ان لڑکیوں کے جانوروں کو پانی پلا کر جب درخت کے سایہ میں آکر بیٹھے اس وقت انہوں نے یہ دعا کی رَبِّ اِنِّیْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ اے پروردگار جو بھلائی بھی تو میرے لئے اتار دے میں اس کا محتاج ہوں۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ بلاوا اسی دعا کا نتیجہ ہے اور تقدیر الٰہی اپنا کام کر رہی ہے رہی اجرت تو وہ فطرتی چیز ہے جس میں مطلقاً کوئی عیب نہیں خود حضرت موسیٰ نے خضر سے کہا تھا کہ تم چاہتے تو دیوار کی مرمت کی اجرت لے سکتے تھے۔

س۔ وَاضْمُمْ اِلَیْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ دبالے اپنی طرف اپنے ہاتھ کو ڈر سے اس سے کیا مقصد تھا۔

ج۔ حضرت موسیٰ اپنے عصا کو سانپ کی شکل میں دیکھ کر ڈر گئے اور پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ اس کا علاج بتایا گیا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے اپنے سینے کو دبالو۔ من الرہب کا لفظ حکم کی علت کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی ڈر دور کرنے کے لئے ان کو حکم دیا گیا۔ دوسرا فائدہ اس کا دہ ہے جو سورہ طٰہٰ کے رکوع ۱ے

میں بیان کیا گیا ہے وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ اپنے ہاتھ کو اپنے سینے
سے دبا چمکتا ہوا نکلے گا یہاں اس کی تشریح ان لفظوں میں ہے اُسْلُكْ يَدَكَ
فِي جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال چمکتا ہوا نکلے گا۔
س۔ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَا إِلَىٰ مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ
مِنَ الشَّاهِدِينَ نہ تھا تو مغربی جانب جبکہ ہم نے موسیٰ کو رسالت
عطا کی۔ اور نہ تھا تو حاضر۔ پہلے جملہ کے بعد دوسرے جملہ کی ضرورت سمجھ میں نہیں آتی۔
ج۔ آگے کی آیت سے اس کا اشارہ ملتا ہے کہ یہ دونوں جملے دو واقعوں سے متعلق ہیں
یعنی موسیٰ کو جب ہم نے رسالت عطا کی اس وقت تم کوہ طور کے مغربی جانب
موجود نہ تھے اور مدین میں جو کچھ ہوا تھا وہاں بھی تم حاضر نہ تھے۔ ان سب کا علم
تم کو بذریعہ وحی کے دیا جا رہا ہے۔ ایسا ہی حضرت مریم۔ نوح اور یوسف کے
قصّوں میں کہا ہے تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ (الآیۃ)
س۔ وَمَا كُنْتَ تَرْجُو أَنْ يُلْقَىٰ إِلَيْكَ الْكِتَابُ إِلَّا رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ۔
تو یہ امید نہیں رکھتا تھا کہ تیرے اوپر کتاب اتاری جائے گی مگر اللہ کی مہربانی
یہ استثنا کیسا ہے؟
ج۔ استثنا منقطع ہے۔ یعنی کتاب کی امید نہیں رکھتا تھا اس لئے کہ تجھ کو خبر نہ
تھی کہ کتاب کیا ہوتی ہے مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ (شوریٰ ۵) تو
جانتا نہ تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے۔ یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ اس
نے یہ چیز تجھ کو عطا فرمائی۔

سورہ عنکبوت

س۔ وَمَا هُم بِحَامِلِينَ مِنْ خَطَايَاهُم مِّن شَيْءٍ وہ کچھ بھی ان کے گناہ نہیں اٹھائیں گے۔ اس سے آگے کی آیت ہے وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ۔ وہ ضرور اٹھائیں گے اپنے بوجھ اور ان کے ساتھ اور بھی بوجھ۔ یعنی اوروں کے گناہوں کے بوجھ بھی اٹھائیں گے۔

ج۔ وہ مومنوں کے گناہوں کے بوجھ نہیں اٹھائیں گے۔ ہاں جن کو گمراہ کیا ہے ان کے گناہوں کا بوجھ ضرور ان پر پڑے گا کیونکہ وہ ان کی گمراہی کا سبب بنے ہیں لہٰذا وہ بھی انہیں کے گناہوں کا بوجھ ہوگا۔

س۔ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ۔ وہ دیدہ ور لوگ تھے عاد و ثمود کے سرغنوں کی عقل و فہم کی مدح کی گئی ہے۔ حالانکہ سخت گمراہ تھے۔

ج۔ اُن میں دنیاوی عقل و فہم تھی اس کا ذکر اس وجہ سے فرمایا ہے کہ مومنوں کو دنیاداروں کی عقل و فہم دیکھ کر اپنے ایمان میں شک نہ پیدا ہو۔

س۔ إِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ۔ سب سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہے۔ کاش وہ جانتے۔ کون نہیں جانتا کہ مکڑی کا گھر سب سے کمزور گھر ہے۔

ج۔ يَعْلَمُونَ کا مفعول پہلا فقرہ ہے۔ یعنی کاش وہ جانتے کہ ماسوا کو مولیٰ بناتا مکڑی کے گھر کی طرح بے بنیاد ہے۔

س۔ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کریں گے اُن کو ہم اپنے راستوں کی ہدایت دیں گے۔ جہاد کی نوبت

توہدایت کے بعد آتی ہے۔

ج۔ پہلے گذر چکا ہے کہ ہدایت کے کئی درجے ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان اللہ کی راہ کی طرف رُخ کرے۔ دوسرا یہ کہ اس پر چلنے لگے۔ تیسرا یہ کہ منزل پر پہنچ جائے۔ یہاں قلب کی ہدایت مقصود ہے جو ایمان کے بعد حاصل ہوتی ہے وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ یَھْدِ قَلْبَہٗ (تغابن ۲) جو اللہ پر ایمان لاتا ہے اللہ اس کے دل کو ہدایت عطا فرماتا ہے۔

سُورۂ رُوم

س۔ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ تم مشرک نہ بنو، مسلمان تو موحد ہوتا ہے۔ پھر یہ نہی کیسی؟

ج۔ اس کی تفسیر اس کے آگے کے جملہ میں ہے مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ ؁ یعنی ان لوگوں میں سے نہ بنو جنہوں نے اپنے دین میں تفریق ڈالی اور ٹولی ٹولی ہو گئے ہر ٹولی اس میں مگن ہے جو اس کے پاس ہے یہ فرقہ بندی شخصیت پرستی سے پیدا ہوتی ہے۔ پھر توحید کہاں رہی اللہ اپنے رسول سے کہتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ (انعام ۲۰) جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہ گروہ ہو گئے تیرا اُن سے کوئی تعلق نہیں۔

س۔ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ اِلٰی یَوْمِ الْبَعْثِ تم رہے اللہ کے نوشتہ میں قیامت تک۔ مُردے تو قبروں میں رہتے ہیں۔

ج۔ مردوں کا جسم قبر میں رہتا ہے جو مٹی میں مل جاتا ہے اور ان کی ذات اللہ کے نوشتہ میں اِنَّ کِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِی سِجِّیْنٍ ۝ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا سِجِّیْنٌ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (مطففین) گنہگار سجین میں لکھے جاتے ہیں تجھے کیا خبر کہ سجین کیا ہے۔ ایک لکھی ہوئی کتاب پھر اس کے آگے ہے اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِیْ عِلِّیِّیْنَ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّیُّوْنَ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ نیکوکار علیین میں لکھے جاتے ہیں تجھے کیا خبر کہ علیون کیا ہے ایک لکھی ہوئی کتاب۔ فرعون نے حضرت موسیٰ سے سوال کیا تھا وَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى کیا حال ہے گزشتہ نسلوں کا۔ انہوں نے فرمایا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ (طٰہٰ) اس کا علم میرے رب کے پاس لکھا ہوا ہے۔

سورۂ لقمان

س۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا۔ بعض لوگ لہو حدیث کے خریدار ہوتے ہیں کہ بلا علم کے لوگوں کو گمراہ کریں اور دین کو مذاق بنالیں۔ یہاں لہو حدیث کے معنی بہت سے مفسرین نے غناء یعنی گانے کے لکھے ہیں۔ لیکن کوئی دلیل نہیں دی ہے۔

ج۔ عربی زبان میں لہو کے معنی شغل کے ہیں اور حدیث کے معنی بات کے۔ یہ دو لفظ ہیں ایک دوسرے کی طرف مضاف۔ سارے عربی ادب میں لہو الحدیث کے معنی غناء کے نظر نہیں پڑے۔ خود اس آیت میں حدیث کی تین صفتیں بیان کی گئی ہیں۔ ۱ اس سے لوگوں کو گمراہ کیا جاتا ہے ۲ وہ غیر یقینی ہے۔ ۳ اس سے دین کو

مذاق بنایا جاتا ہے۔ غنا میں بہ صفتیں نو روایات، قصص، افسانے اور خرافات وغیرہ کی ہیں قرآن میں ہے نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ (البقرہ ع ۱۲) اہل کتاب کی ایک جماعت نے اللہ کی کتاب کو ایسا پس پشت ڈال دیا کہ گویا اس کو جانتے ہی نہیں اور پیروی کی ان باتوں کی جن کو سناتے ہیں سلیمان کی سلطنت کے بارے میں۔ یعنی کتاب الٰہی سے ہٹ کر روایات اور تاریخی قصص کی پیروی کرتے ہیں[1]۔

س[2]۔ إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ۔ سب سے بری آواز گدھوں کی آواز ہے۔ مگر اس کو بنایا اللہ ہی نے ہے جس نے بلبل کو نغمہ عطا فرمایا ہے اور اس کا قول ہے أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ (سجدہ ع ۱) اس نے جو چیز بنائی ہے خوب بنائی ہے۔

ج۔ اشیاء کا حسن و قبح ہمارے لحاظ سے ہے۔ ورنہ خیر و شر، ملک و ابلیس اسلام اور کفر سب اس کی مشیت کے مطابق ہے۔

سورۂ سجدہ

س[1]۔ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ۔ امر چڑھتا ہے اس کی طرف ایک زمانہ میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے

---

[1] حدیث کے متعلق ہم نے متعدد مبسوط مقالات لکھے ہیں جو ہمارے مجموعہائے مضامین میں شائع ہو چکے ہیں۔

ہزار سال ہوتی ہے اور سورہ معارج میں ہے فِی یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ ایک زمانہ میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔

ج۔ عروج امر سے مراد ہے امر کا خاتمہ بڑے بڑے اوامر تدبیری بتدریج اپنا دور کم و بیش ایک ہزار سال میں پورا کر دیتے ہیں اور سورہ معارج میں روح اور ملائکہ کا عروج ہے جو اوامر تدبیری کے کارکن ہیں اُن کے عروج سے اس عالم کا خاتمہ مراد ہے یعنی قیامت جیسا کہ اس کے آگے ہے یَوْمَ تَکُوْنُ السَّمَآءُ کَالْمُہْلِ وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِہْنِ اس دن آسمان ہوگا پگھلے ہوئے تانبے کی طرح اور پہاڑ ہوں گے اُون کی طرح۔

س۔ وَنَفَخَ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِہٖ اللہ نے اس میں اپنی روح پھونک دی اللہ روح سے منزہ ہے۔

ج۔ یہ آیات متشابہات میں سے ہے جن کی بابت سوال و جواب سے فتنہ میں پڑ جانے کا خطرہ ہے جیسا کہ کہا گیا ہے اس پر ایمان ہے۔

س۔ قُلْ یَتَوَفّٰکُمْ مَّلَکُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُکِّلَ بِکُمْ۔ کہہ دے کہ تمہاری جان نکالتا ہے ملک الموت جو تمہارے اوپر مقرر کیا گیا ہے سورہ انعام ۸ میں ہے تَوَفَّتْہُ رُسُلُنَا ہمارے فرستادے اس کی جان نکالتے ہیں اور سورہ زمر ۵ میں ہے اَللہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا اللہ لوگوں کی جان نکالتا ہے ان کی موت کے وقت یہ متعارض باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

ج۔ سب کا مفہوم ایک ہے۔ سورہ انعام کی آیت مذکورہ میں ہے یُرْسِلُ عَلَیْکُمْ حَفَظَۃً حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْہُ رُسُلُنَا اللہ تمہارے اوپر محافظ بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت آتی ہے تو ہمارے فرستادے اس کی جان نکال لیتے ہیں یعنی جو فرشتے انسانوں کی جانوں پر موکل ہیں وہی ملک الموت

ہیں جو ان کی مدت حیات پوری ہو جانے پر ان کی جان نکال لیتے ہیں اور عالم ملکوت کے کارکن جو کچھ کرتے ہیں۔ وہ بامر الہٰی کرتے ہیں اس لئے جان نکالنے کی نسبت اللہ کی طرف بھی صحیح ہے۔

س۔ وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ کافر کہتے ہیں کہ یہ فیصلہ کب ہوگا۔ اس کے جواب میں ہے قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِيْمَانُهُمْ کہہ دے کہ فیصلہ کے دن کافروں کو ایمان لانا فائدہ نہ دے گا سوال اور جواب میں مطابقت واضح نہیں ہوتی۔

ج۔ کافروں کا یہ سوال استہزاء کے طور پر تھا۔ اس لئے جواب دینے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ صرف یہ ظاہر کر دیا کہ یہ پوچھنا بے کار ہے۔ اس دن ایمان لانے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

سورۂ احزاب

س۔ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ نبی کی بیویاں مسلمانوں کی مائیں ہیں۔ لیکن خود نبی کو مسلمانوں کا باپ قرار نہیں دیا۔ بلکہ اس کے برخلاف فرمایا مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ۔ محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔

ج۔ عورت کے احترام کا بالاترین درجہ امومت ہے۔ اس وجہ سے ازواج نبیؐ امت کی مائیں قرار دی گئیں بخلاف اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کا باپ نہیں قرار دیا۔ کیونکہ خود نبی اور رسول کا درجہ باپ کے درجہ سے بہت زیادہ بلند ہے۔ اُن کے لئے کہا گیا اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ نبی

مومنوں سے خود اس کی ذات سے بھی زیادہ قریب ہے اس واسطے کہ کبھی باپ بیٹے سے اور کبھی بیٹا باپ سے اپنے آپ کو الگ کر لیتا ہے مگر خود اپنی ذات سے کوئی برأت نہیں کر سکتا۔

س ۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى وَعِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ جب ہم نے نبیوں سے اقرار لیا اور تجھ سے اور نوح سے اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے یہاں ترتیب زمانی کے خلاف خاتم النبیین کا ذکر سب سے پہلے کیا اور سورہ شوریٰ ع۲ میں حضرت نوح کا نام سب سے پہلے لیا شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى وَعِیْسٰۤى ابْنِ مَرْیَمَ

ج ۔ حضرت نوح سب سے پہلے رسول ہیں اور خاتم النبیین سب سے آخری فضیلت کے لحاظ سے یہاں خاتم النبیین کا ذکر پہلے کیا اور تقدم زمانی کے لحاظ سے سورہ شوریٰ میں حضرت نوح کا باقی انبیاء کا دونوں آیتوں میں ایک ہی ترتیب یعنی زمانہ کے لحاظ سے ہے۔

س ۔ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ پہنچ گئے ان کے دل گلے تک۔ دل گلے تک پہنچنے پر موت لازمی ہے۔ پھر احسان کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے۔

ج ۔ بول چال کے لحاظ سے اس کا یہ مطلب ہے کہ شدت خوف سے قریب تھا کہ دل اُچھل کر گلے تک پہنچ جائیں۔

س ۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ اللہ بس یہی چاہتا ہے کہ دور کر دے تم گھر والوں سے برائی کو۔ یہاں اہل بیت سے مراد حضرت فاطمہؓ کی اولاد لی جاتی ہے۔ لیکن یہ گھر تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔

ج ۔ اہل بیت کے معنی گھر والوں کے ہیں اور عام طور پر اہل خانہ یعنی بیوی کے لئے

مستعمل ہے یہاں بھی اس لفظ سے ماقبل اور مابعد ازواج نبیؐ ہی کا ذکر ہے۔
اس لئے وہی مراد ہیں۔ حضرت فاطمہؓ کی اولاد اس میں بذریعہ روایت کے شامل
کی گئی ہے۔ قرآن میں دوسری جگہ بھی یہ لفظ اسی معنیٰ میں آیا ہے رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ
بَرَكَاتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ (ھودؑ) یہاں حضرت ابراہیمؑ کی بیوی سے خطاب ہے۔
سؔ - يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ اے مومنو!
نبیؐ پر درود اور سلام بھیجو۔ صرف نبیؐ پر درود اور سلام بھیجنے کا حکم ہے۔ لیکن مروجہ
درود میں جس کو ہر مسلمان نمازوں میں پڑھتا ہے۔ نبیؐ کے ساتھ آل پر بھی درود بھیجا
جاتا ہے۔

ج - یہ قرآن پر اضافہ بھی روایت ہی کے ذریعہ سے کیا گیا ہے۔
سؔ - اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا۔ ہم نے اپنے
سرداروں اور بزرگوں کی اطاعت کی انہوں نے ہم کو سیدھی راہ سے گمراہ کردیا۔
سادات اور کبریٰ دونوں ہم معنی ہیں ان میں سے ایک ہی کیوں نہ کافی سمجھا گیا۔
ج - دونوں مختلف معانی میں بھی بولے جاتے ہیں۔ سردار وہ ہے جو اپنی ذاتی لیاقت
یا وجاہت سے سربرآوردہ ہو گیا ہو۔ اور کبراء آباؤ اجداد۔ اللہ کی اطاعت کے
سوا سب کی اطاعت گمراہی ہے کیونکہ حاکمیت اسی کی ہے لیکن اس کی اطاعت
ہوتی ہے بذریعہ رسول یا اس کے مقرر کئے ہوئے امراء کے جو پیرو ہوتے ہیں خالص
قرآن کے۔
سؔ۹ - اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا انسان ہے بڑا ظالم۔ سخت جاہل۔ انسان نے
بارِ امانت اٹھالیا جس کے اٹھانے کے لئے آسمان زمین اور پہاڑ بھی راضی نہ
ہوتے۔ پھر اس کو ظالم اور جاہل اور وہ بھی مبالغہ کے ساتھ کیوں کہا گیا۔
ج - بارِ امانت اٹھا لینے پر اس کو ظالم جاہل نہیں کہا گیا ہے بلکہ اس کی سرشتی کمزوری

بیان کی گئی ہے کیا عصیان اور اس کے نتیجہ سے بے خبری چھوٹا ظلم و جہل ہے جس سے اس نے نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ نوع انسانی کو جنت سے نکلوا دیا۔

سورۂ سباء

س۱۔ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ اور جنوں میں سے کچھ لوگ کام کرتے تھے اس کے سامنے اپنے مالک کے حکم سے۔ کیا یہ جن حضرت سلیمانؑ کے یہاں مزدوری کرتے تھے وہی تھے جو آگ سے بنائے گئے ہیں۔

ج۔ جن ایک تو وہ ہیں جو آگ سے پیدا کئے گئے ہیں۔ ان کو جا بجا جان کے لفظ سے قرآن نے تعبیر کیا ہے۔ سورہ حجر میں بھی اور سورہ الرحمٰن میں بھی وہ نظر آتے ہیں۔ دوسری قسم کے جن جو انس کے ساتھ قرآن میں بولے گئے ہیں وہ انسانوں ہی کا ایک طبقہ ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے یہاں جو ٹھٹھیرے اور راج وغیرہ کا کام کرتے تھے وہ اپنے فنی کمال اور سرکشی کی وجہ سے جن کہے گئے۔ دوسری جگہ انہیں کے لئے شیاطین کا لفظ آیا ہے وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ (انبیاء ۶) شیطان جو غوطہ خوری کرتے تھے۔ اس کے لئے اور اس کے سوا اور بھی کام کرتے تھے اور یہ مقید رکھے جاتے تھے مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ (ص ع ۳) زنجیروں میں بندھے ہوئے۔

س۲۔ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ اس کے لئے بناتے تھے محرابیں، مورتیں، لگن حوض جیسے اور دیگیں اپنی جگہ پر جمی ہوئی۔ حضرت سلیمان ایسے عظیم الشان نبی اور مورتیں بنواتے تھے۔

ج۔ بتوں اور مورتوں وغیرہ کو پوجنا شرک ہے اور ان کی تعظیم ناجائز۔ حضرت سلیمان ان کو آرائش کے لئے بنواتے تھے اور قرآن نے حضرت سلیمان پر انعامات الٰہی کے شمار میں ان چیزوں کا ذکر کیا ہے اور ان پر ان کو شکریہ ادا کرنے کا حکم دیا ہے اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُکۡرًا داؤد کے فرزندو شکر بجالاؤ۔

سورۂ فاطر

س۔ اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ اسی کی طرف پاک کلمہ چڑھتا ہے اور عمل صالح اس کو بلند کرتا ہے۔ کیا کلمہ طیبہ کو اللہ تک پہنچنے میں مدد کی ضرورت ہوتی ہے؟

ج۔ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ایمان اللہ کے نزدیک عمل صالح سے مقبول ہوتا ہے۔

س۔ وَالَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ مَا یَمۡلِکُوۡنَ مِنۡ قِطۡمِیۡرٍ ؕ اِنۡ تَدۡعُوۡہُمۡ لَا یَسۡمَعُوۡا دُعَآءَکُمۡ ۚ وَ لَوۡ سَمِعُوۡا مَا اسۡتَجَابُوۡا لَکُمۡ ؕ وَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یَکۡفُرُوۡنَ بِشِرۡکِکُمۡ اللہ کے ماسوا جن کو تم پکارتے ہو وہ ایک چھلکے کے بھی مالک نہیں ہیں۔ اگر تم ان کو پکاروگے تو وہ تمہاری پکار نہیں سنیں گے۔ اور جو سنتے بھی تو جواب نہ دیتے۔ اور قیامت کے دن تمہارے شرک کا انکار کردیں گے۔ بعض مفسروں نے ماسوا سے یہاں بت مراد لئے ہیں۔

ج۔ مشرک اپنے خیال میں بزرگان دین اور مقربین بارگاہ کو اپنا سفارشی اور اللہ کی طرف اپنا وسیلہ بنانے کے لئے پکارتے ہیں۔ انہیں کی بابت کہا گیا ہے

نہیں سُنتے۔ سورہ نحل میں ان سے علم و شعور کی نفی گذر چکی ہے یہ بُت نہیں
ہیں۔ قیامت کے دن شرک کا انکار کرنے کی قدرت بتوں میں کہاں ہو گی
سورہ نحل ع۱۲ میں اس کی مزید تشریح ہے وَاِذَا رَاَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا
شُرَکَآئَھُمْ قَالُوْا رَبَّنَا ھٰٓؤُلَآءِ شُرَکَآؤُنَا الَّذِیْنَ کُنَّا نَدْعُوْا
مِنْ دُوْنِكَ فَاَلْقَوْا اِلَیْھِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَکٰذِبُوْنَ ۔ قیامت
میں جب مشرکین اپنے شرکاء دیکھیں گے اس وقت کہیں گے اے ہمارے رب
یہ ہیں وہ شرکاء جن کو ہم تیرے سوا پکارتے تھے۔ وہ شرکاء ان کو جواب دیں گے کہ
تم بالکل جھوٹے ہو۔

سورۂ یٰسٓ

ع۲۔ فَطَرَنِیْ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ اللہ نے مجھے پیدا کیا اور تم اسی کی طرف پلٹ
کر جاؤ گے۔ دنیاوی زندگی کو اپنی طرف منسوب کیا اور اُخروی زندگی کو مخاطبوں
کی طرف۔ اسلوب کا تقاضا یہ تھا کہ اللہ نے مجھے پیدا کیا ہے اور مجھے اسی کی طرف
لوٹ کر جانا ہے۔
ج۔ دنیاوی زندگی مومن کے لئے نعمتِ الٰہی ہے جس میں وہ نجات حاصل کرنے کا
سامان کرتا ہے اور اُخروی زندگی کافروں کے لئے سزا بھگتنے کی جگہ ہے۔ اس وجہ سے
اس نے دنیاوی زندگی کو اپنی طرف منسوب کیا شکریہ کے طور پر۔ اور اُخروی
زندگی کو مخاطبوں کی طرف تاکہ ان کو دلوں میں خوف پیدا ہو۔
ع۳۔ اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللہُ اَطْعَمَهٗ ۔ کیا ہم اس کو کھلائیں جس کو اگر اللہ چاہتا

تو کھلاتا۔ فقیروں کو نہ کھلانے کی یہ توجیہہ کفار کس بنیاد پر کرتے تھے؟
ج۔ ان کی منطق یہ تھی کہ ہم مشیتِ الٰہی کے پابند ہیں جس کو اللہ نے نہیں کھانے کو دیا اس کو ہم کیوں دیں۔ سورہ انعام ع۱۸ نیز سورہ نحل ع۵ میں ان کا قول بیان کیا گیا ہے لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ اگر اللہ چاہتا تو اس کے سوا ہم کسی چیز کو نہ پوجتے۔ یہی خیال ان سے پہلے سے بھی مشرکوں میں چلا آتا تھا۔ قرآن نے بتلایا کہ مشیتِ الٰہی مقصود نہیں بلکہ رضائے الٰہی مقصود ہے لَا یَرْضٰی لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ وَاِنْ تَشْكُرُوْا یَرْضَهُ لَكُمْ (زمر ع۱) وہ اپنے بندوں کے کفر پر راضی نہیں ہے۔ اور اگر تم شکر کرو گے تو اس سے راضی ہو گا۔ حالانکہ کفر اور شکر سب اس کی مشیت کے ماتحت ہیں۔
س۔ وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰی رَبِّهِمْ یَنْسِلُوْنَ ۝ قَالُوْا یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا۔ صور پھونکا جائے گا ایک دم۔ وہ قبروں سے اپنے رب کی طرف چل پڑیں گے اور کہیں گے ہائے ہماری شامت کس نے ہم کو ہماری خوابگاہ سے جگا دیا۔ کیا ہزاروں سال تک قبروں میں رہنے کا احساس ان کو نہیں ہو گا۔؟
ج۔ مُردوں میں نہ حیات ہے نہ شعور نہ کسی قسم کا احساس اور نہ ان کے اوپر زمانہ گذرتا ہے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جس وقت وہ قیامت میں اٹھائے جائیں گے حیرت سے کہیں گے کہ ہم کو کس نے ہمارے بسترِ خواب سے جگا دیا۔ صرف نیک بندے نہیں بلکہ مجرم بھی یہی خیال کریں گے وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَیْرَ سَاعَةٍ (روم ع۵) جس دن قیامت آئے گی گنہگار قسم کھائیں گے کہ وہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے سورہ یونس ع۵ اور سورہ احقاف ع۴ میں بھی یہی بات کہی گئی ہے مزید تفصیل کے ساتھ۔

سؔ ۔ مِمَّا عَمِلَتۡ اَیۡدِیۡنَا اَنۡعَامًا جو چوپائے ہمارے ہاتھوں نے بنائے
اللہ ہاتھ پاؤں سے منزہ ہے۔

ج ۔ اس میں کیا شک ہے مگر وہ جو کچھ ہم کو سمجھاتا ہے اسی زبان میں سمجھاتا ہے جس کو ہم بولتے ہیں۔ کوئی فعل بلا شرکت غیرے جب کسی کی طرف منسوب کرتا ہوتا ہے تو اس کو اس کے ہاتھ کا فعل کہتے ہیں۔ یہاں بھی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ان چوپایوں کو اکیلے اللہ ہی نے بنایا ہے۔

سورۂ صافات

سؔ ۔ اِنَّہٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ نوح ہمارے مومن بندوں میں سے ہے
رسول کا درجہ تو مومن سے بڑا ہے۔

ج ۔ مومنوں کیلئے ایمان کا رتبہ ظاہر کرنے کیواسطے کہ یہ چیز رسول میں بھی قابل مدح ہے۔

سؔ ۔ اِنِّیۡ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ سَیَهۡدِیۡنِ میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں وہ مجھے ہدایت دے گا۔ رب کی طرف جانے کا مطلب کیا ہے اور حضرت ابراہیم تو خود ہدایت یافتہ تھے۔ ان کو کس ہدایت کی ضرورت تھی؟

ج ۔ رب کی طرف جانے سے مراد اس سرزمین کی طرف ہجرت کرنا ہے جہاں وہ اپنے اکیلے رب کی عبادت کر سکیں اور اس میں ہر قدم پر ان کو ہدایت کی ضرورت تھی جیسے بنی اسرائیل کو جب فرعون ان کا پیچھا کرتا ہوا نظر آیا اور آگے سمندر تھا تو وہ ڈر گئے اور کہنے لگے کہ اب ہم پکڑے گئے حضرت موسیٰ نے فرمایا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیۡ سَیَهۡدِیۡنِ (شعراء ۶۲) میرے ساتھ میرا رب ہے وہ راستہ دکھائے گا۔

سورۂ ص

سؔ ۔ اِنِّیٓ اَحۡبَبۡتُ حُبَّ الۡخَیۡرِ اجبت میں خود حب کا لفظ موجود ہے اس کے مکرر لانے کی کیا غرض ہے۔

ج۔ اجبت کے معنی پسند کرنے کے بھی آتے ہیں وَاَمَّا ثَمُوۡدُ فَھَدَیۡنٰھُمۡ فَاسۡتَحَبُّوا الۡعَمٰی عَلَی الۡھُدٰی (حٰم السجدہ) ثمود کو ہم نے راہ دکھائی انہوں نے ہدایت پر گمراہی کو پسند کیا۔ یہاں یہ معنی ہوئے کہ میں نے ذکر الٰہی پر مال کو پسند کیا۔

سؔ ۔ خَلَقۡتَنِیۡ مِنۡ نَّارٍ وَّخَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِیۡنٍ ۔ ابلیس نے کہا کہ تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو مٹی سے۔ مگر مٹی پر آگ کی ترجیح کی کوئی وجہ اس نے بیان نہیں کی۔

ج ۔ آگ تخریبی عنصر ہے اور مٹی تعمیری۔ اس لئے مٹی پر اس کی ترجیح کی کوئی وجہ موجود ہی نہیں۔ بجز اس کے کہ اس کے شعلوں میں سرکشی ہے[1]۔

---

[1] علامہ جلال الدین سیوطی اپنی کتاب الفلک المشحون میں ۱۸ وجوہ سے مٹی کی برتری آگ پر ثابت کی ہے۔

سورۂ زمر

سؓ۔ وَ اَنْزَلَ لَکُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَۃَ اَزْوَاجٍ اتارے تمہارے لئے چوپائے آٹھ نر و مادہ۔ اتارنے کا کیا مفہوم ہے۔ چوپائے تو پیدا کئے جاتے ہیں۔

ج- پانی برسنے سے نباتات اور حیوانات کی پیدائش ہوتی ہے اور پانی چونکہ بلندی سے اترتا ہے اس لئے اتارنے کا لفظ استعمال کیا۔ سورہ اعراف ع۳ میں ہے قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا ہم نے اتارا تمہارے اوپر لباس سورہ حدید ع۳ میں ہے وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ ہم نے لوہا اتارا۔

سؒ۔ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَۃٌ جنہوں نے بھلائی کی اس دنیا میں ان کے لئے بھلائی ہے۔ مفسروں نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ جنہوں نے اس دنیا میں بھلائی کی ان کے لئے آخرت میں بھلائی ہے۔ یعنی هٰذِهِ الدُّنْیَا کو اَحْسَنُوْا کا متعلق گردانا ہے حسنہ کا نہیں۔

ج- یہ تفسیر صحیح نہیں۔ بھلائی تو جب کی جائے گی دنیا ہی میں کی جائے گی اس کی شرط لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جن لوگوں نے بھلائی کی ان کو اس دنیا میں بھلائی ملے گی۔ دوسری جگہ ہے لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَۃٌ وَّ لَدَارُ الْاٰخِرَۃِ خَیْرٌ (نحل ع۴) جنہوں نے احسان کیا اسی دنیا میں ان کو بھلائی ملے گی اور آخرت کا بدلہ تو بہت ہی بہتر ہوگا۔

سورۂ مومن

س۲ - قَالُوا رَبَّنَا اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ اے رب تو نے ہم کو دو بار موت دی اور دو بار زندہ کیا۔ یہ دو موت اور دو حیات کون سی ہیں؟

ج۔ سورہ بقرہ ع۳ میں اس کی تشریح ہے كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ تم مُردہ تھے اللہ نے تم کو زندگی عطا فرمائی پھر تم کو موت دے گا۔ پھر زندہ کرے گا۔ انسان کی دنیا میں پیدائش سے پہلے کی حالت کو موت سے تعبیر کیا۔ پھر یہ زندگی دی۔ پھر اس دنیا میں موت ہوگی جس کے بعد قیامت کے دن دوسری زندگی ملے گی ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ (مومنون ع۱) اس دنیاوی زندگی کے بعد تم ضرور مرو گے پھر قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔ قبر میں زندگی کا قرآن سے ثبوت نہیں ملتا۔

س۵ - اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ آگ جس پر پیش کئے جاتے ہیں آل فرعون صبح اور شام اور جس دن قیامت ہوگی حکم دیا جائے گا کہ آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کرو۔ اس سے عذاب برزخ لوگ نکالتے ہیں۔

ج - يُعْرَضُوْنَ مضارع کے صیغہ کو حال کے معنی میں اُن لوگوں نے لیا ہے جو عذاب برزخ کے قائل ہیں۔ حالانکہ یہاں استقبال کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ سورہ ہود ع۹ میں تصریح ہے يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ - فرعون

آگے ہوگا اپنی قوم کے قیامت کے دن اور ان کو آگ میں اتارے گا دوسرا جملہ
اس کی تفسیر ہے کہ اس دن فرشتوں کو حکم دیا جائے گا کہ سب سے سخت عذاب
میں ان کو داخل کرو غُدُوًّا وَعَشِيًّا کے معنی ہیں ہمیشہ۔ جنتیوں کے لئے بھی
سورہ مریم ۴ میں ہے وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا ۔ ان کو ان
کی روزی ہمیشہ ملتی رہے گی[1]

سورۂ حٰم سجدہ

س۔ وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ اللہ نے زمین میں
روزیاں رکھیں چار دن میں۔ قرآن میں جا بجا یہی کہا گیا ہے کہ زمین اور آسمان
چھ دنوں میں بنائے گئے ہیں۔ لیکن یہاں جوڑنے سے آٹھ دن ہو جاتے ہیں۔
ج۔ یہاں بھی چھ ہی دن ہیں فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ کے معنی ہیں فِي تَتِمَّةِ أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ
یعنی زمین کی تخلیق دو دن میں ہوئی۔ اس میں روزیاں دو دن میں
مقدر ہوئیں۔ یہ چار دن ہو گئے۔ پھر دو دن میں ساتوں آسمان بنائے گئے۔

---

[1] عالم برزخ پر ہمارا ایک مبسوط مقالہ ہے جس میں یہ بحث تفصیل کے ساتھ کی گئی ہے یہ ہمارے مجموعہ مضامین "افادات اسلم" میں شائع کیا گیا ہے۔

سورۂ شوریٰ

س۲۳۔ قُلْ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی۔ اے نبی کہہ دے کہ میں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں سوائے رشتہ کی محبت کے اس کی تفسیر میں بعض لوگوں نے کہا ہے کہ میں کوئی اجر نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ میرے رشتہ داروں سے محبت رکھو۔

ج۔ یہ تفسیر نہیں بلکہ تحریف معنوی ہے اگر یہ مقصد ہوتا تو عبارت ہوتی اِلَّا الْمَوَدَّۃَ لِاُقْرَبِی قربٰی کے معنی قرابت کے ہیں۔ قربت دار کے نہیں ہیں اور اس کا استعمال فی کے ساتھ ہوا ہے۔ یعنی قرابت کی محبت۔ جتنے رسول یا نبی پہلے آئے ہر ایک نے اپنی قوم سے یہی کہا کہ ہم تم سے تبلیغ رسالت پر کسی اجر کے خواہاں نہیں ہیں۔ ہمارا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ چنانچہ ہر پیغمبر کے قصہ میں مختلف سورتوں خاص کر سورہ شعراء میں یہ امر تصریح کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ خاتم النبیین کی زبان سے سب سے بڑھ کر یہ اعلان کرایا گیا کہ میں تم سے اجر تو کیا کسی خاص تعظیم کا بھی طالب نہیں ہوں۔ صرف رشتہ کا برتاؤ چاہتا ہوں جو معاشرانہ حق ہے۔ اہل غرض نے اس پاک اور بے غرض تعلیم کو تحریف کر کے اپنے مقصد کے مطابق بنانے کی کوشش کی۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم امت سے مطالبہ کرتے کہ میری تبلیغ کے بدلہ میں تم میرے اقرباء سے محبت رکھو تو اس سے بڑا اور کون سا اجر ہو سکتا تھا کیوں کہ ان کی محبت اجر رسالت ہونے سے ان کو خلافت اور امامت کا منصب دینا بھی لازم آجاتا اور اس تحریف سے ان کی اصلی غرض یہی تھی۔

س۲۹۔ وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِیْہِمَا مِنْ دَآبَّۃٍ

اللہ کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور ان جانداروں کا جو ان میں بکھیر دیے ہیں۔ زمین میں تو جاندار ہم دیکھتے ہیں کیا آسمانوں میں بھی اسی قسم کے جاندار ہیں یا فرشتے مراد ہیں۔

ج۔ دابہ اور فرشتے الگ الگ مخلوق ہیں وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ آسمانوں اور زمین میں جتنے جاندار اور فرشتے ہیں سب ہی اللہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ سماء کے معنی بلندی کے ہیں اُن میں جو کُرے پڑے گھوم رہے ان میں بھی ہر قسم کے جاندار اور فرشتے اسی طرح ہیں جس طرح زمین میں۔

سورۂ زخرف

س۔ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا کتاب مبین شاہد ہے کہ ہم نے اس کو عربی قرآن بنایا۔ کتاب مبین سے کیا مراد ہے؟

ج۔ سورہ انعام ۷ میں ہے وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ جو بحر و بر میں ہے اللہ اس کو جانتا ہے اور جو پتا گرتا ہے اس کا علم رکھتا ہے اور جو دانا زمین کی تاریکی میں ہے اور جو تر اور خشک ہے سب کتاب مبین میں ہے اس سے ظاہر ہو گیا کہ کتاب مبین سے مراد علم الٰہی ہے۔ اسی کتاب مبین کو اللہ نے عربی قرآن بنایا ہے۔ کائنات فطرت فعل الٰہی کتاب مبین، علم الٰہی اور قرآن قول الٰہی ہے اور یہ تینوں متحد ہیں۔

س۵۔ وَلَا يَكَادُ يُبِيْنُ فرعون نے کہا موسیٰ تو صاف بول بھی نہیں سکتے کیا ان کی لکنت باقی تھی؟ انہوں نے جو بہت سی دعائیں کی تھیں ان میں یہ دعا بھی تھی کہ میری زبان کی گرہ کھول دے اور اللہ نے ان کی یہ دعائیں قبول فرمائی تھیں۔ پھر لکنت کیسے رہ گئی؟

ج۔ حضرت موسیٰ نے دعا میں فرمایا تھا وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ (طٰہٰ۲) ایک گرہ میری زبان کی کھول دے کہ لوگ میری بات سمجھنے لگیں۔ یہ دعا قبول ہوئی جس سے اُن کی لکنت کم ہوگئی مگر پھر بھی کچھ رہ گئی تھی جس کی بدولت حضرت ہارون کو نبوت ملی۔

سُورۂ دخان

س۳۔ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى جنتی بجز پہلی موت کے جنت میں کوئی موت نہیں چکھیں گے لیکن وہ پہلی موت جنت میں تو نہیں ہوئی پھر استثناء کیسا۔

ج۔ اِلَّا اگرچہ حرف استثنا ہے مگر کہیں کہیں اس کے معنی سوا کے بھی ہوتے ہیں سورہ نساء ۴ میں ہے وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ جن عورتوں سے تمہارے باپوں نے نکاح کیا اُن سے نہ نکاح کرو سوائے اس کے جو ہو چکا۔ یہاں یہ معنے ہوئے کہ سوائے پہلی موت کے جو انہوں نے چکھی تھی۔ جنت میں موت نہیں چکھیں گے۔

سورہ جاثیہ

س۔ كُلُّ أُمَّةٍ تُدْعَىٰ إِلَىٰ كِتَابِهَا ہر قوم اپنی کتاب کی طرف بلائی جائے گی
پھر آگے ہے هَٰذَا كِتَابُنَا يَنطِقُ عَلَيْكُم بِالْحَقِّ یہ ہماری کتاب تمہارے
بارے میں ٹھیک ٹھیک کہہ رہی ہے۔ کتاب ایک ہی ہے اسی کو کبھی قوم کی
طرف منسوب کیا ہے کبھی اپنی طرف۔

ج ۔ کتاب قوم کی طرف اس لئے مضاف ہے کہ اس میں ان کے اعمال لکھے ہوئے
ہیں اور اللہ کی طرف اس لئے کہ کراماً کاتبین نے اس کے حکم سے لکھا ہے۔

سورۂ احقاف

س۔ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھوڑنا
تیس مہینے میں ہے۔ دونوں کی مدت ایک ساتھ بیان کرتے ہیں۔ کیا فائدہ ہے؟

ج۔ یہ بیان ہے ماں کی اس تکلیف کا جو اولاد کے لئے اس کو برداشت کرنی پڑتی
ہے یعنی حمل و رضاعت جن کا سلسلہ ایک ہی ہے۔ اس لئے دونوں کی مدت
ایک ہی ساتھ بتائی گئی اور وہ بھی کم سے کم۔ ورنہ سورہ بقرہ ع۳۰ میں صرف
رضاعت کی مدت دو سال بتائی گئی ہے اور حمل کی مدت بالعموم ۹ ماہ ہوتی
ہے اس طرح پونے تین سال کی مدت ہو جاتی ہے۔

سورۂ محمّد

س ۔ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً اس کے بعد یا تو احسان رکھ کر یا فدیہ لے کر یعنی لڑائی میں جو دشمن گرفتار ہوں ان کو چھوڑ دو یا مفت احسان کر کے ۔ یا فدیہ لے کر۔ پھر یہ ملک یمین یعنی غلاموں اور لونڈیوں کا مسئلہ قرآن میں کیوں ہے؟

ج ۔ غلامی کا صرف ایک ہی راستہ تھا یعنی اسیران جنگ ۔ قرآن نے یہ حکم دے کر کہ ان کو چھوڑ دو۔ اس کا راستہ بالکل بند کر دیا۔ مگر جو غلام پہلے سے عربوں کے پاس تھے وہ ان کی معاشی زندگی میں اس قدر دخیل تھے کہ فوراً ان کی آزادی کا حکم دے دیا جاتا تو قوم کی اقتصادی حالت بگڑ جاتی۔ اس لئے قرآن نے جس کا اصول تدریجی اصلاح ہے۔ رفتہ رفتہ ان کی آزادی کی صورت نکالی۔ قتل خطا نقض یمین اور ظہار وغیرہ کا کفارہ یہی رکھا کہ غلام آزاد کرو۔ نیز فک رقبہ کی فضیلت جتا کر عام نعمتوں کے شکریہ اور گناہوں کے استغفار میں اس کی رغبت دلائی اور مکاتب کرنے کا بھی حکم دیا تاکہ جلد از جلد انسانی غلامی کی لعنت ملت اسلامیہ سے نکل جائے۔ قرآن میں انہیں کا مسئلہ ہے ۔

س ۔ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے اللہ ان کے اعمال کو نہیں کھوئے گا ان کو ہدایت دے گا اور ان کا حال ٹھیک کرے گا ۔ موت کے بعد ہدایت اور اصلاح حال کیونکر ہو گی ؟

ج ۔ شہیدوں کی زندگی کے تسلسل میں موت سے فرق نہیں پڑتا ۔ وہ دنیاوی زندگی سے اخروی زندگی کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں ۔ سورہ بقر میں اس کی توضیح گذر چکی ہے ۔

عالم اخروی میں کیا کچھ ہوگا یہ وہیں چل کر معلوم ہوگا۔ وہاں کی ہدایت اور اصلاح حال کی کیفیت یہاں ہماری سمجھ کی دسترس سے باہر ہے۔

سؔ۲۔ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ مثال اس جنت کی جس کا متقیوں سے وعدہ ہے۔ بجائے حقیقت کے تمثیل کیوں بیان کی گئی ہے؟

ج۔ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جنت اور دوزخ کے بارے میں جو آیات ہیں وہ متشابہات میں سے ہیں۔ اسی لئے ان کا بیان تمثیلی اور تشبیہی ہے سورۂ سجدہ ع۲ میں یہ حقیقت بیان کر دی گئی ہے لَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ کسی کو معلوم نہیں کہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لئے کیا چھپا کر رکھا گیا ہے۔

سورۂ فتح

سؔ۱۔ إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ ہم نے تجھ کو نمایاں فتح دی۔ تاکہ اللہ تیرے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دے۔ فتح مغفرت کے لئے تھی یا اعلاء کلمۃ الحق کے لئے۔ اور اگلے گناہ کی معافی کے ساتھ پچھلے گناہ کی معافی کے معانی ہوئے کیونکہ ان کا تو ابھی وجود ہی نہیں ہے۔

ج۔ فتح سے یہاں بیعت رضواں مراد ہے جس سے اسلام کے جاں نثاروں کی ایک قومی جماعت تیار ہو گئی۔ اس پر مغفرت اتمام نعمت۔ ہدایت اور کامیابی کا وعدہ کیا گیا۔ جیسا کہ آگے کی آیت میں ہے اور پچھلے گناہ اگر وجود میں آئیں گے تو ان کی معافی کا بھی وعدہ ہے۔

سورۂ حجرات

س۱ ۔ لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ
نبی کی آواز پر اپنی آوازیں اونچی نہ کرو اور اس کے لئے زور سے نہ بولو۔ دونوں جملے ہم معنے معلوم ہوتے ہیں۔

ج ۔ فرق ہے ۔ پہلا جملہ عام ہے کہ نبی کے حضور میں اونچی آواز سے نہیں بولنا چاہیئے دوسرا خاص کہ نبی کو بلند آواز سے اس طرح مخاطب نہ کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو کرتے ہو۔ اس کی توضیح سورہ نور کے آخری رکوع میں ہے لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ۔ رسول کو اس طرح نہ پکارو جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔

سورۂ ق

س۲ ۔ فَبَصَرُكَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ تیری نگاہ آج کے دن تیز ہے۔ قیامت کے دن اللہ کافروں سے کہے گا کہ تمہاری آنکھوں سے غفلت کا پردہ اٹھ گیا۔ اب تمہاری نگاہ تیز ہے۔ دوسری جگہ ہے وَنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی (طٰہٰ) اس کو ہم اٹھائیں گے اندھا۔

ج ۔ گنہگاروں کے طبقات مختلف ہیں ان کے حالات بھی مختلف ہیں۔

سورہ والذّاریات

س۳۲ ۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۔ میں نے جنّ و انس کو صرف اپنی بندگی کے لئے پیدا کیا ہے ۔ پھر ان میں سے زیادہ تعداد نافرمان کیوں ہے؟

ج ۔ اللہ نے فرمایا ہے وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ (اعراف ع۲۲) ہم نے کثیر تعداد جنّ و انس کی جہنم کے لئے پھیلا رکھی ہے ۔ یہی لوگ ہیں جو نافرمان ہیں ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی جہالت دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے اور اپنی مسئولیت کے خیال سے ڈرتے تھے ۔ یہاں تک کہ اللہ نے فرمایا لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (شعراء ع۱) شاید تو اس کے پیچھے اپنی جان گنوا دے گا کہ یہ ایمان نہیں لاتے ۔ دوسری جگہ یہ حقیقت واضح کی وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (سجدہ ع۲) اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو اس کی راہ دکھا دیتے لیکن یہ تو میں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ جنّ و انس سے جہنم کو ضرور بھر دوں گا اور رسول کو ان کی بازپرس سے بری کر دیا وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ (بقرہ ع۱۴) جہنمیوں کی بابت تجھ سے نہیں سوال کیا جائے گا ۔

سورۂ طور

س۱ ۔ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ان کو بیاہ دیں گے حور عین کے ساتھ ۔ کیا

جنت میں بھی شادیاں ہوں گی؟

ج۔ ہم دنیا میں جس کو شادی سمجھتے ہیں اس پر جنت کی شادی کا قیاس صحیح نہ ہوگا۔ غالباً اسی فرق کو ظاہر کرنے کے لئے اس کو بؔ کے ساتھ متعدی کیا ہے ورنہ عام طور پہ عربی میں تزویج کا استعمال بلا صلہ کے ہے۔ خود قرآن میں ہے ـــ زَوَّجْنَاكَهَا۔ (الاحزاب ۵)

سؔ۲۔ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ کون سی چیز اللہ کی آنکھوں کے سامنے نہیں ہے؟

ج۔ ایسا جا بجا اہمیت کے اظہار کے لئے کہا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ کی شان میں ہے لِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِىْ (طٰہٰ ۲) تاکہ تیری پرورش ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔ حضرت نوحؑ کی کشتی کے بارے میں ہے تَجْرِىْ بِاَعْيُنِنَا (القمر ۱) ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی۔

سورۂ نجم

سؔ۱۔ اَفَرَاَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى کیا تم نے سمجھ رکھا ہے لات اور عزّیٰ اور تیسری منات کو۔ مراد رویت قلب ہے جس کے لئے اصولاً دو مفعول ہونے چاہئیں۔

ج۔ دوسرا مفعول ہے۔ اللہ کی بیٹیاں جس کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ وہ دوسری آیت سے جو اس کے آگے ہے سمجھ میں آجاتا ہے۔

سُورۂ قمر

س۱ - اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ قیامت قریب آئی اور چاند پھٹا۔ اس سے لوگوں نے معجزہ شق القمر پر استدلال کیا ہے۔

ج - یہ استدلال صحیح نہیں۔ کیونکہ اس کے ماقبل یا مابعد رسول کا ذکر نہیں ہے بلکہ قیامت کا ہے اور یہ اسی کے قرب کی نشانی بیان کی گئی ہے۔ آخری پارہ کی مختلف سورتوں میں اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ جب آسمان پھٹ جائے گا اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ جب سورج تاریک ہو جائے گا۔ وغیرہ قیامت ہی کے علامات ہیں ماضی کا صیغہ جو یہاں لایا گیا ہے تو قرآن میں قیامت حشر و نشر بلکہ جنت و دوزخ کے آنیوالے واقعات بیشتر ماضی ہی کے صیغہ میں مذکور ہیں۔ سورہ بنی اسرائیل میں بیان کیا جا چکا ہے کہ خاتم النبیین کو حسی معجزہ جو آنکھوں سے دیکھا جائے نہیں دیا گیا بلکہ عقلی معجزہ قرآن دیا گیا ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

س۲ - وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً - ہم نے نوح کی کشتی کو نشانی رکھ چھوڑا ہے کیا وہ اب تک محفوظ ہے؟

ج - قرآن میں سفینۂ نوح کو نشانی بنانے کا ذکر کئی مقام پر ہے۔ سورہ عنکبوت ع۲ میں ہے وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ - ہم نے اس کشتی کو دنیا والوں کیلئے نشانی بنا دیا۔ کچھ زمانہ ہوا پتہ لگا کہ وہ نشانی مل گئی اور محفوظ ہے[1]

---

[1] چند سال ہوئے اخباروں اور رسالوں میں مضامین شائع ہوئے کہ وہ کشتی مل گئی - جودی پہاڑ پر سے جہاں برف کے نیچے دبی ہوئی وہ محفوظ تھی برف کی چٹانوں کے ساتھ لڑھک کر نیچے آگئی ہے پہلے روسی فوج کے کسی ہوا باز نے اس کو دیکھا۔ پھر اور لوگ گئے - انگریزی ترکی اور مصری وفود بھی جا کر اس کو دیکھ آئے شدہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

سورۂ رحمٰن

سؔ۔ سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَا الثَّقَلٰنِ ۝ ہم جلد رخ کریں گے تمہاری طرف اے جن و انس۔ کیا اللہ کو مشغولیت رہتی ہے جس سے وہ فارغ ہو۔

ج ۔ یہ دھمکی کا دستور ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے حساب و کتاب کا وقت جلد آرہا ہے۔

سورۂ واقعہ

سؔ۔ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۔ غلمان ہمیشہ رہنے والے۔ جنت میں سب کو خلود ہے۔ ان خدام کو مخلد کہنے کی کیا خصوصیت ہے۔

ج ۔ ان کا خلود اس وجہ سے بیان کیا گیا کہ وہ ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے۔ جنت میں رہ کر بھی کبھی جوانی تک نہیں پہنچیں گے۔

سورۂ حدید

سؔ۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ

(حاشیہ صـــ سے آگے) اسی پیمانہ کے مطابق ہے جو توریت میں مذکور ہے۔ خدائی کے دعویدار فرعون کی لاش کے بعد یہ دوسری بڑی نشانی بھی دنیا نے دیکھ لی جن سے قرآن کے بیان کی صداقت آشکارا ہو کر رہی۔

وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ جو لوگ اللہ اور رسول پر ایمان لائے وہی اللہ کے نزدیک صدیق و شہید ہیں۔ صدیق اور شہید کے درجے نبی کے بعد ہیں کیا ہر مومن کو نصیب ہو سکتے ہیں؟

ج۔ اور کیا اُن کی کوئی خاص علامت ہوتی ہے؟ یہ ایمان ہی کے تو مدارج ہیں۔ شہید کا لفظ قرآن میں دین کے مبلغ اور محافظ کے لئے جابجا مستعمل ہوا ہے اور وہ مومن کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔

س۔ سَابِقُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ سبقت لے جاؤ اپنے رب کی مغفرت کے لئے۔ کس سے سبقت لے جاؤ؟

ج۔ موت سے۔ یعنی مرنے سے پہلے ایمان اور عمل صالح سے اپنے آپ کو رب کی مغفرت کا مستحق بنالو۔ آل عمران ع۱۴ میں ہے وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ جلدی کرو اپنے رب کی مغفرت کی طرف۔ یہ سارعو کا لفظ سابقوا کی تفسیر ہو سکتا ہے۔

سورۂ مجادلہ

س۔ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور غالب آکر رہیں گے۔ لیکن دنیا کی حالت دیکھتے ہوئے تو اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ ہر طرف شیطان ہی کا غلبہ نظر آتا ہے۔

ج۔ کیا دنیا ختم ہو گئی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کا انجام کیا ہونا ہے۔ قرآن یقین دلاتا ہے وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ انجام اللہ سے ڈرنے والوں کے حق میں ہوگا۔

سورہ حشر

سؔ۔ مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَھُوْا
رسول جو تم کو دے لے لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ۔ محدثین اس آیت کو حدیثوں کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔

ج۔ یہاں مال فے کی تقسیم کا بیان ہے کہ اس میں سے رسول جو تم کو دیدے لے لو اور جو نہ دے اس سے باز رہو۔ حدیثیں رسول نے دی نہیں ہیں بلکہ فرمائی ہیں۔ آتا کے معنی سارے قرآن میں کہیں کہنے یا حکم دینے کے نہیں ہیں۔ غلط فہمی نہا کے لفظ سے ہوئی ہے جس کے معنی منع کرنے کے بھی ہیں اور روکنے کے بھی۔ لوگوں نے نہا کے بالمقابل آتا کے لفظ کو اَمر یا قال کے معنی میں لیا جو نہ صرف لغت بلکہ قرآن کی رُو سے بھی صحیح نہیں ہے۔

سؔ۔ لَوْ اَنْزَلْنَا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ــــ اگر اس قرآن کو ہم کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تو دیکھتا کہ وہ اللہ کے خوف سے گر کر پاش پاش ہو جاتا۔ پہاڑ پہ قرآن اتارنے کا کیا مفہوم ہے۔

ج۔ اس جملہ سے قرآن کی عظمت کا اظہار مقصود ہے جس طرح اللہ کے جلوہ سے کوہ طور ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ اسی طرح اس کلام سے اگر وہ کسی پہاڑ پہ نازل ہوتا تو وہ پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔

سورۂ ممتحنہ

س۔ اِلَّا قَوْلَ اِبْرَاهِيْمَ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ بجز ابراہیم کے اس قول کے جو انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ میں تیرے لئے مغفرت مانگوں گا۔ یہ استثناء کس سے کیا گیا ہے؟

ج۔ اس سے اوپر آیت گذری ہے قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ اِبْرَاهِيْمَ تمہارے لئے ابراہیم کے اندر اچھا نمونہ ہے۔ یعنی ابراہیم کی پیروی کرو بجز اس وعدے کے جو انہوں نے اپنے باپ سے کیا۔ کیونکہ مومن کو مشرک کی مغفرت مانگنے کی ممانعت ہے خواہ وہ باپ ہی کیوں نہ ہو۔

سورۂ صف

س۔ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ اَحْمَدُ۔ بشارت دینے والا ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔ حضرت عیسیٰ نے اس بشارت میں آپ کا مشہور نام محمدؐ کیوں نہ لیا۔

ج۔ رسول اللہ کے یہ دونوں نام ہیں۔ غالباً بشارت میں جو لفظ تھا اس کا صحیح ترجمہ احمد بصیغۂ تفضیل ہے[1]۔

---

[1] اس بیسویں صدی میں انجیل برنابا اس ملی ہے اس کے عربی ترجمہ میں محمد کا لفظ ہے۔ یہ ترجمہ مصر کے ایک عیسائی محاج نے دیانا کے کتب خانہ میں جا کر کیا جہاں یہ انجیل اسپینش زبان میں موجود ہے۔

سورۂ جمعہ

سؔ۔ اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ۔
جمعہ کے دن جب نماز کے لئے اذان ہو تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو۔ لیکن دوڑنا تو سنجیدگی کے خلاف ہے۔

ج ۔ سعی کے معنی یہاں دوڑنے کے نہیں بلکہ پیش قدمی کرنے کے ہیں۔ یہ لفظ قرآن میں کئی جگہ اس معنی میں استعمال ہوا ہے فَلَمَّا بَلَغَ مَعَہُ السَّعْیَ (صافات ع۳) جب اسماعیل ان کی معیت میں کام کرنے لگا۔ دوسری جگہ ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (النجم ع۳) انسان کے لئے وہی ہے جو اس نے کیا۔

سورۂ منافقون

سؔ۔ اِذَا جَآءَکَ الْمُنَافِقُوْنَ قَالُوْا نَشْھَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ
وَاللّٰہُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُہٗ وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ لَکَاذِبُوْنَ ہ
جب منافق تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ کو علم ہے کہ تو حقیقت میں اس کا رسول ہے اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ یہ منافق بالکل جھوٹے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ منافقوں کو سچی شہادت دینے پر بھی اللہ جھوٹا کہتا ہے۔

ج ۔ اس لئے کہ جو کچھ وہ زبانوں سے کہتے تھے ان کے دلوں میں نہ تھا عرف عام میں

صدق اس کو کہتے ہیں جو واقع کے مطابق ہو اور کذب اس کو جو واقع کے خلاف ہو لیکن قرآن کے نزدیک صدق و کذب کا مدار زبان اور قلب کی موافقت اور مخالفت پر ہے۔

سورہ تغابن

س۲۔ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ جو اللہ پر ایمان لائے گا اللہ اس کے قلب کو ہدایت دے گا۔ ایمان ہدایت کے بعد نصیب ہوتا ہے اور ہدایت ایمان کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ یہ تو دَور لازم آتا ہے۔

ج۔ ہدایت کے مختلف مراتب ہیں جو سورہ اعراف میں بیان کئے جا چکے وہ ہدایت کا پہلا درجہ ہے جس سے ایمان ملتا ہے اور یہاں قلب کی ہدایت یعنی شرح صدر مراد ہے جو ایمان کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

سورہ طلاق

س۱۔ وَالّٰٓـئِىْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓـئِىْ لَمْ يَحِضْنَ تمہاری بیویاں جو حیض سے مایوس ہو چکی ہیں اگر تم کو شک ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے۔ اور اُن کی بھی جن کو حیض نہیں آیا ہے۔ فقہاء نے ان عورتوں سے جن کو حیض نہیں آیا

سے نابالغ لڑکیاں مراد لی ہیں اور یہاں طلاق کی عدت بیان کی گئی ہے اور طلاق تو اسی کو ملے گی جس کا نکاح ہو چکا ہے۔ اس لئے نکاح صغیرہ کے جواز پر اس سے استدلال کیا ہے۔

ج۔ یہ استدلال صحیح نہیں۔ کیونکہ ہر زمانہ میں ایسی بالغ عورتیں ہوتی ہیں جن کو عوارض کی وجہ سے حیض نہیں آتا۔ یہاں لَمْ يَحِضْنَ سے ایسی ہی عورتیں مراد ہیں نہ کہ صغیرہ۔ کیونکہ صغیرہ کے ساتھ نکاح غیر فطرتی ہے جس کا قرآن حکم نہیں دے گا اس لئے کہ وہ دین فطرت لے کر آیا ہے چنانچہ قرآن نے مَا حَضْنَ نفی کا صیغہ نہیں استعمال کیا ہے بلکہ لَمْ يَحِضْنَ جحود کا صیغہ استعمال کیا ہے اور نفی اور جحود میں فرق ہے ماحضن کے معنی ہیں جن کو حیض نہیں آیا۔ لیکن لَمْ يَحِضْنَ کے معنی ہیں جن کو حیض نہیں آسکا ہے۔ اس میں صرف وہ عورتیں آتی ہیں جو بالغ ہو چکی ہیں مگر عارضی موانع کی وجہ سے ان کو حیض نہیں آیا ہے۔

سورۂ تحریم

سؔ۔ فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا ہم نے مریم میں اپنی روح پھونکی۔ یہاں ضمیر مذکر لائی گئی ہے اور سورہ انبیاء ع۶ میں فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا ضمیر مؤنث ہے۔

جؔ۔ اس ضمیر کا مرجع مونث سماعی ہے جس کے لئے دونوں قسم کی ضمیریں آسکتی ہیں۔ جیسے نار مونث سماعی ہے۔ اس کے لئے سورہ سجدہ میں ہے ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّذِي كُنتُم بِهِ تُكَذِّبُونَ ٥ اور سورۂ سبا میں ہے ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّتِي كُنتُم بِهَا تُكَذِّبُونَ ٥

سُورۂ مُلک

س۔ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ کیا اللہ کی تخلیق میں تو کوئی فرق دیکھتا ہے۔ کیوں نہیں فرق ہے۔ چھوٹے بڑے اونچے نیچے نر اور خشک سبھی ہیں۔

ج ۔ تفاوت کا مفہوم یہاں باہمی فرق نہیں ہے۔ بلکہ نقص یا عیب ہے جس کی تائید آگے کے جملہ سے ہوتی ہے فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ دوبارہ نظر ڈال کیا تو کوئی خلل دیکھتا ہے۔

سورۂ قلم

س۔ یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّیُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ۝ جس دن حقیقت آشکار ہو جائے گی اور وہ سجدہ کے لئے پکارے جائیں گے تو نہیں کر سکیں گے۔ کیا آخرت دار التکلیف ہے کہ وہاں سجدہ کا حکم ہوگا؟

ج ۔ ٹھیک معلوم نہیں کہ آخرت میں کیا ہوگا۔ قرآن میں اشارات ضرور ہیں مثلاً وہاں استقامت ہوگی یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ (ابراہیم ۲۷) اللہ مومنوں کو پختہ قول پر جمائے رکھے گا۔ دنیاوی زندگی اور آخرت میں بھی۔ وہاں صلاحیت ہوگی وَاٰتَیْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی الدُّنْیَا وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ (عنکبوت ۲۷) ہم نے ابراہیم کو اس دنیا میں اس کا اجر عطا فرمایا اور وہ آخرت میں صلاحیت رکھنے

والوں میں سے ہوگا۔ مومنوں کے متعلق بھی ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ۔ (عنکبوت ۹) جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح کئے اُن کو ہم صالحین میں ضرور داخل کریں گے۔ وہاں اتمام نور بھی ہے۔ مومن قیامت کے دن دعا کریں گے رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا (تحریم ۸) اے ہمارے رب ہمارے نور کو مکمل کر دے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نشاۃ ثانیہ میں نیک بندوں کے لئے مقبول زندگی کا رخ آشکارا ہو جائے گا جسے دیکھ کر کافر چلائیں گے يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ (والفجر) کاش میں نے اپنی زندگی کے لئے پہلے کچھ کر لیا ہوتا۔

سورۂ حاقہ

س۔ وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ۔ جہنمیوں کے لئے کوئی خوراک نہ ہو گی مگر دھوون شَجَرَةَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِيْمِ سینڈھ کا درخت گناہ گار کی غذا۔ تیسری جگہ ہے لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ہ اُن کا کوئی کھانا نہ ہوگا سوائے کنٹلی جھاڑی کے۔ کیا ان میں تعارض نہیں ہے۔

ج۔ یہ جہنمیوں کے مختلف طبقات کی مختلف غذائیں ہیں۔ ان میں باہمی تعارض کا خیال صحیح نہیں۔

سورۂ معارج

س۔ اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ ۝ جو اپنی نماز پر قائم ہیں۔ پھر اس کے آگے ہے وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ دونوں میں ایک ہی بات معلوم ہوتی ہے۔ پھر دہرانے کی ضرورت کیوں ہوئی؟۔

ج۔ نماز پر مداومت کرنا اور چیز ہے اور اس کو حضورِ قلب کے ساتھ ادا کرنا اور چیز۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی پابندی کے ساتھ نماز ادا کرے لیکن توجہ الی اللہ کے شرائط پورے نہ کرے۔

سورۂ نوح

س۔ وَاللّٰهُ اَنْبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝ اللہ نے تم کو زمین سے اگایا زمین سے تو نباتات اُگائے جاتے ہیں۔ نہ کہ حیوانات۔ خاص کر انسان۔

ج۔ اس سے پہلے فرمایا ہے وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۝ اللہ نے کئی طور سے تم کو پیدا کیا۔ انسان کی تخلیق کا سلسلہ لمبا ہے۔ ہمارے سامنے جو کچھ ہے وہ یہ کہ نطفہ سے پیدا ہوتا ہے لیکن انسان تخلیق کے کتنے مدارج طے کر کے بنایا گیا ہے۔ ان کا صحیح علم اللہ کو ہے۔ قرآن میں جا بجا اس کی طرف اشارے ملتے ہیں۔

سورۂ جنّ

س۔ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ جب اللہ کا بندہ کھڑا ہوا۔ کیوں نہ رسول کہا
ج۔ یہ جنّوں کی جماعت تھی جو غالباً یہودی تھے۔ کیونکہ سورۂ احقاف میں بھی یہی قصہ بیان کیا گیا ہے جس میں ان جنّوں نے کہا ہے کہ ہم نے موسیٰ کے بعد یہ سنا کہ ایک کتاب اتری ہے جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور حق کی راہ دکھاتی ہے۔ یہ لوگ قرآن سن کر مسلمان ہو گئے۔ انہوں نے عبد اللہ کا لفظ مقام مدح میں استعمال ہے۔

سورۂ مزّمّل

س۔ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝ ہم اتاریں گے تجھ پر بھاری بات۔ کس حیثیت سے قرآن کو بھاری کہا گیا؟
ج۔ حقانیت کے لحاظ سے پہلے گذر چکا ہے کہ اگر اس قرآن کو ہم پہاڑ پر اتارتے تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا دوسری جگہ فرمایا ہے نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَی الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُهٗ (انبیاء ۲ع) ہم حق کو اتارتے ہیں باطل پر وہ اس کا سر کچل دیتا ہے۔

سورۂ مدثر

سؑ۔ مَاذَآ اَرَادَاللّٰہُ بِھٰذَا مَثَلاً فرشتے جو جہنم پر متعین ہیں ان کی تعداد کو اللہ نے مثل کیوں فرمایا؟

ج۔ آل عمران میں یہ بیان گزر چکا ہے کہ جنت اور دوزخ متشابہات میں سے ہیں اُن کے بارے میں جو بیانات ہیں وہ تمثیلی ہیں۔ ایسا ہی جنت کی نہروں کا بیان سورہ محمدؐ میں تمثیلی ہے۔

سورۂ قیامہ

سؑ۔ وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ کچھ چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے۔ اپنے رب کو دیکھ رہے ہوں گے۔ چہرے دیکھ رہے ہوں گے یا آنکھیں دیکھ رہی ہوں گی۔

ج۔ یہ ہر شخص جانتا ہے کہ چہروں میں آنکھیں ہوتی ہیں جو دیکھتی ہیں۔ چہرہ کا لفظ یہاں تازہ روئی کے اظہار کے لئے لایا گیا ہے۔

سورۃ الدّھر

سؑ۔ نَحْنُ خَلَقْنٰھُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَھُمْ ہم نے ان کو پیدا کیا اور

اُن کے جوڑ مضبوط باندھے۔ اور دوسری جگہ ہے وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۝
انسان کمزور پیدا کیا گیا۔
ج ۔ انسان کے جوڑ رگوں اور پٹھوں سے باندھے گئے ہیں جو اس کی پوری عمر تک کام دیتے ہیں۔ اس لئے یہ بندشیں مضبوط کہی گئی ہیں اور وہ ضعیف اس لحاظ سے ہے کہ اس میں نفس اور شیطان سے مقابلہ کرنے کی قوت کم ہے۔

سورۂ مرسلات

سؔ ۔ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ۝
یہ وہ دن ہے کہ نہ بولیں گے اور نہ ان کو اجازت دی جائے گی کہ عذر پیش کریں ۔ دوسری جگہ ہے يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ (مومن ۵۲) اس دن ظالموں کو ان کی معذرت فائدہ نہ دے گی۔
ج ۔ گنہگار نہیں بولیں گے دہشت کے مارے اور بولنے کی اجازت نہ ہو گی کیونکہ ان کے ہاتھ اور پاؤں گواہی دے رہے ہوں گے ۔ جن کو معذرت کی اجازت دی جائے گی وہ غلط ہونے کی وجہ سے کار آمد نہ ہو گی ۔ جیسے مشرکوں کی بابت سورہ انعام میں گذر چکا ہے کہ جھوٹی قسمیں کھائیں گے کہ ہم مشرک نہ تھے ۔ قیامت میں مختلف قسم کے گنہگاروں کے حالات مختلف ہوں گے ۔

سورۂ نباء

س۔ وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَٰلَيْتَنِي كُنتُ تُرَابًا کافر کہے گا کاش میں مٹی ہوتا۔
بالعموم مفسروں نے لکھا ہے کہ قیامت کے دن جانور حساب کے بعد مٹی بنادیے جائیں گے۔ ان کو دیکھ جہنمی کہیں گے کہ کاش ہم بھی مٹی ہوجاتے۔ کیا یہ تفسیر صحیح ہے؟
ج۔ قرآن سے یہ بات نہیں ظاہر ہوتی کہ جانور قیامت کے دن حساب کے بعد مٹی بنا دیے جائیں گے۔ اس لئے یہ تفسیر کیسے صحیح کہی جاسکتی ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہولناک عذاب کو دیکھ کر وہ کہیں گے کہ کاش ہم مٹی ہی ہوتے آدمی نہ بنائے گئے ہوتے۔

سورۂ تکویر

س۔ وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ میں مارڈالی گئی۔ سوال کا دستور قاتل سے ہے نہ کہ مقتول سے۔
ج۔ یہ سوال قاتل کے سامنے اس کے جرم کے اظہار کے لئے ہوگا کیونکہ وہ تو یہی کہے گی کہ مجھے کچھ نہیں معلوم جیسے حضرت عیسٰی سے سوال کیا جائے گا أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ (المائدہ ۱۱۶)
کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو دو خدا بنالو اللہ کے سوا۔ وہ جواب دیں گے کہ میں کیونکر وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا۔

س۔ اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ بے شک یہ قول ہے ایک معزز رسول کا۔ قرآن قول الٰہی ہے۔ اس کو رسول کا قول کس لحاظ سے کہا گیا۔

ج۔ رسول سے مراد ہے روح الامین جس کے ذریعہ سے اللہ کا کلام رسول امین پر اترتا تھا یہی بات سورہ حاقہ میں کہی گئی ہے جس کے بعد تصریح کر دی گئی ہے تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ رَبّ العٰلمین کا اتارا ہوا۔ وہی تصریح یہاں بھی کام دے گی۔

سورۂ انفطار

س۔ يٰاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ الَّذِيْ خَلَقَكَ
اے انسان کیوں بہک گیا تو اپنے رب کریم سے جس نے تجھ کو پیدا کیا ہے۔ اللہ نے اپنے صفات میں سے یہاں کریم کی صفت کو کیوں مخصوص فرمایا ہے۔

ج۔ انسان کی تخلیق اور اس کی پرورش اللہ کے ایسے نمایاں صفات ہیں جن کو ہر شخص دیکھتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کا ذکر فرمایا۔ آگے سورۂ علق میں انسان کو علم دینے پر اپنے کو رب اکرم بصیغہ تفضیل کہا ہے وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خلعت علم لباس وجود سے بھی زیادہ عزت کی چیز ہے۔

س۔ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا اس دن کوئی کسی کا بھلا نہ کر سکے گا۔ اور لوگ شفاعت جو کریں گے؟

ج۔ شفاعت ساری اللہ کے ہاتھ میں ہے قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا (زمر ۵)

کہہ دے کہ ساری شفاعت اللہ ہی کے لئے ہے اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت نہیں کر سکے گا۔ اس لئے شفاعت کا بھی اللہ کے سوا کوئی مالک نہیں۔

سورۂ فجر

س۔ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ اللہ انسان کو نعمت دیتا ہے تو انسان کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو عزت دی۔ یہ بات تو اس کی سچی ہے۔ پھر اس پر اس کی مذمت کیوں کی گئی۔

ج۔ وہ لوگوں کے سامنے یہ بات بطور تحدیث نعمت کے نہیں بلکہ بطور فخر کے کہتا ہے۔ سورہ زمر ۵ میں ہے اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ جب ہم اپنی طرف سے کوئی نعمت اس کو دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ مجھ کو علم کی بدولت ملی ہے۔ جیسے قارون نے کہا تھا اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (قصص ۵) یہ مال مجھ کو میرے ایک ہنر کی بدولت ملا ہے۔

س۔ وَجَآءَ رَبُّكَ آئے گا تیرا رب۔ اللہ حرکت، جہت وغیرہ سے بری ہے۔ اس کے آنے کے کیا معنی ہوئے۔

ج۔ اللہ کی ذات اور اس کی صفات آیات متشابہات میں سے ہیں جن پر صرف ایمان مطلوب ہے۔ ان میں چون وچرا کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔ نہ ان کی کیفیت کی بابت سوال کیا جا سکتا ہے۔ ان میں بحثیں کرنا سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھنا ہے۔

سورہ بیّنہ

س۔ یَتْلُوْ صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ پڑھتا ہے پاک صحیفے جن میں لکھی ہوئی ہیں ہدایت کی باتیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھے ہوئے تھے۔

ج۔ قرآن نے تصریح کردی ہے کہ آنحضرت ناخواندہ تھے وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّهُ بِيَمِيْنِكَ (عنکبوت ۵) اس سے پہلے سے نہ تو نے کوئی کتاب پڑھی تھی نہ اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا۔ یہاں جس تلاوت کا ذکر ہے وہ زبانی تھی۔ قرآن کی جو آیتیں نازل ہوتی تھیں اُن کو آپ ازبر کرلیتے تھے۔ اللہ نے وعدہ کیا تھا سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى (سورۃ الاعلیٰ) ہم تجھ کو پڑھا دیں گے۔ پھر تو نہیں بھولے گا۔ نہ صرف یاد کرانے بلکہ اس کی حقیقت سمجھا دینے کا بھی اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (القیامہ) ہمارے ذمہ ہے اس کا یاد کرانا اور پڑھا دینا۔ جب ہم پڑھیں تو بھی ساتھ پڑھ پھر ہمارے ذمہ ہے اس کی تشریح۔

سورۃ الزلزال

س۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ

شَـرًّا یَّرَهٗ ۔ جس نے ذرّہ بھر بھلائی کی ہے اس کو دیکھے گا ۔ اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہے اس کو دیکھے گا۔ جب قیامت کے دن سارے گناہ دیکھنے پڑیں گے۔ تو مغفرت اور معافی کے کیا معنے ہوئے۔

ج ۔ گناہوں کی مغفرت نیکیوں کے باعث ہوتی ہے اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ (ھود) نیکیاں برائیوں کو دور کرتی ہیں۔ قیامت کے دن گناہ تو سب موجود ہوں گے لیکن ان کے مقابل کے پلڑے میں جب نیکیاں پڑیں گی تو گناہ کے وزن کو مٹا دیں گی۔ اسی طرح نیکیوں کے مقابل میں اگر گناہ زیادہ ہو گئے تو نیکیوں کا وزن جاتا رہے گا اسی کا نام حبطِ عمل ہے فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِیْمُ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَزْنًا (کہف ۱۲) ان کے اعمال اکارت گئے ہم قیامت کے دن اُن کے وزن نہیں قائم کریں گے۔

سورۂ فیل

س ۔ فَاَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ ۝ اللہ نے بھیجے ان کے اوپر جھنڈ کے جھنڈ پرند۔ اصحاب فیل کے اوپر کس قسم کے پرند بھیجے گئے تھے اور کس غرض کے لئے ؟

ج ۔ اصحاب فیل عظیم الشان لشکر لے کر یمن سے کعبہ کو ڈھانے چلے تھے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ چھپ کر غیر معروف راستہ سے آئیں تاکہ عربی قبائل اور خود مکہ والوں کو خبر نہ ہو سکے ورنہ وہ لڑنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ اللہ نے اُن کے اوپر کرگسوں کے جھنڈ کو ساتھ کر دیا جو بالعموم لاشوں کی امید میں ایسی

فوجوں کے ساتھ ہو جایا کرتے ہیں جس کا متعدد عربی شعراء کے اشعار میں تذکرہ ملتا ہے، یہی معنے طیر کے سورۂ یوسف میں ہیں وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَیُصْلَبُ فَتَاْکُلُ الطَّیْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ دوسرا ساتھی سولی پر چڑھایا جائے گا، اس کا سر گدھ کھائیں گے اِن گدھوں کی وجہ سے اصحاب فیل کا فریب نہ چل سکا جس کا بیان آگے کی آیت میں ہے اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَهُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ، کیا اللہ نے ان کے داؤ کو بیکار نہیں کر دیا؟ اہلِ مکہ مدافعت کیلئے آگئے لیکن وہ اِس بھاری لشکر کا رُو دررُو مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، اسلئے انہوں نے پہاڑ پر سے تین مقامات پر اُن پر پتھراؤ کیا جس کا ذکر آگے ہے تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ تو پھینکتا تھا اُن پر پتھر کنکر کے، تَرْمِیْ واحد مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔ اس کا فاعل وہی مخاطب ہے، جو شروع سورۃ میں اَلَمْ تَرَ کا ہے یعنی مکہ کا باشندہ اسی کے ساتھ اصحاب فیل پر اللہ کا عذاب نازل ہوا جس سے ان کا بڑا حصہ ہلاک ہو گیا، باقی بھاگ گئے[1]

سورۂ کافرون

س۔ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ۔ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ۔ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ۔ میں اس کو نہیں پوجوں گا جس کو تم پوجتے ہو اور نہ تم پوجتے ہو جس کو میں پوجتا ہوں، اور نہ میں پوجنے والا جس کو تم نے پوجا، اور نہ تم پوجنے والے جس کو میں پوجوں۔ ایک ہی بات مکرر کیوں کہی گئی۔

ج۔ یہاں معنوی تکرار نہیں ہے، پہلا جملہ زمانہ حال اور استقبال سے تعلق رکھتا ہے، اور دوسرا زمانہ ماضی سے، کفار سے دینی قطع تعلق کیلئے یہ موکد طریق بیان اختیار کیا گیا ہے۔

---

[1] اس سورۃ کی تفسیر غلط روایات سے معمہ بنا لی گئی ہے ہم نے اس کو کسی قدر مفصل اپنے مضمون "حقیقتِ حج" میں لکھا ہے جو ہمارے مجموعہ مضامین "نوادرات" میں شائع ہو چکا ہے۔

س ۔مشرکین اپنے معبودوں کے ساتھ اللہ کو بھی تو پوجتے تھے ؟
ج ۔اللہ کے ساتھ دوسروں کو ساجھی مان کر اس کی عبادت کرنا عبادت ہی نہیں ہے ۔
کیونکہ اس سے نہ مغفرت حاصل ہوتی ہے نہ نجات ،بلکہ ایسا شخص کافروں اور
منکروں سے بھی گیا گذرا ہوا ہے ۔

سورۂ والنّاس

س ۔اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۔ مَلِكِ النَّاسِ ۔ اِلٰهِ النَّاسِ ۔ مَیں پناہ چاہتا ہوں
انسانوں کے ربّ، انسانوں کے مالک اور انسانوں کے معبود کے پاس ۔یہاں
رَبِّ النَّاسِ جیسا کہ اس سے پہلی سورۃ میں رَبِّ الْفَلَقِ ہے، پھر اس کے
بعد مَلِكِ النَّاس اور اِلٰهِ النَّاس کہنے کی کیا خاص ضرورت ہوئی ؟
ج ۔اس دعا سے یہ تعلیم مقصود ہے کہ ربوبیّت ،عبودیّت اور الوہیت ہر لحاظ سے
اللہ کی توحید کی پناہ میں جو آجاتا ہے اس کو ہر قسم کے وسوسوں سے خواہ
انسانی ہوں یا شیطانی ،نجات مل جاتی ہے ۔

تمّت بالخیر